

لکھنے والی سیریاں

سے سجانا زک پیر ٹھنڈے ماربل پہ پڑا اور ایک سردی لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ ساتھ ہی بھاری پازہیں چھٹک چھٹک گئیں۔ اب تک اسے جس راستے سے گزار کر یہاں اس کمرے تک لایا گیا تھا وہاں اس نے وہیز قالینوں کی نرمی ہائی ہیل کی سینڈل کے باوجود محسوس کی تھی، جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ خوش رنگ قالینوں پہ بکھری پھولوں کی پتیاں بھی دیکھی تھیں اور اب وہ قدرے حیرت کے ساتھ ننگے پیر کے نیچے سرمئی جھاگ کا سا چمکدار سنگی فرش دیکھ رہی تھی۔

بیڈ پہ بھی وہ آرائش مفقود تھی جو عموماً "دلہنوں کے

دروازہ بند ہونے کی آواز سے اس نے محسوس کیا کہ کوئی کمرے میں موجود نہیں، خود کو تنہا پاتے ہی اس پہ چھائی گھبراہٹ عروج پر جا پہنچی تھی۔ حلق خشک ہونے کو تھا۔

نرمین باجی جاتے جاتے اسے کمرے میں موجود ضرورت کی ہر چیز کے بارے میں بتا گئی تھیں لیکن پھر بھی اس کی ہمت نہ ہوئی ہاتھ بڑھا کے سائیڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھانے کی۔ کچھ منٹ کے بعد بھاری آنچل کی جھری سے نگاہیں ادھر ادھر دوڑا کر اس نے کسی کے نہ ہونے کا اطمینان کیا اور پھر اس کے سچے سنورے وجود میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ مندی کے گل بوٹوں

مکمل ناول



استقبال کی غرض سے کی جاتی ہے۔ ویلوٹ کا ڈارک گرے کور بچھا تھا جس کے وسط میں اور سرہانوں کے اوپر ایک انتہائی جان دار سا گلاب کا پھول پرست تھا۔ جان دار اس لیے کہ دور سے ہی اس کی پتیوں پہ پڑے شبنم کے قطروں کی نمی محسوس ہوتی تھی۔ اس نے ذرا سا ہاتھ بڑھا کے اس خمیلیں نقش پہ انگلیاں پھیریں۔ سائڈ ٹیبل پہ رکھے خوش نما گلہ ان میں تازہ گلاب خوبصورتی سے سجائے گئے تھے۔ فضا میں ان کی خوشبو اس طرح رچی ہوئی تھی کہ اسے اپنے بدن سے اٹھتی ایٹن، مندی اور عطر کی محک مدھم رزتی محسوس ہوئی۔ صندل اور چنیل کی عطر میں گوندہ گوندہ کے یہ ایٹن ات اس کی بچپن کی سہلی نازو نے تین دن تک لگایا تھا اور ہاں۔ اس کے آنسو بھی تو اس میں گندھے ہوئے تھے۔ اسے اشکوں کے موتی تحفے میں دینے کے سوا اور وہ کیا کر سکتی تھی۔ حالانکہ کوئی اس کے دل سے پوچھتا کہ نازو کے آنسو اسے کتنی طمانیت دے رہے تھے۔ اسے یہ سوچ سوچ کر تسکین ہو رہی تھی کہ کوئی تو ہے کوئی تو ہے اس بھری دنیا میں اس کی رخصتی پہ رونے والا۔

نازو کی یاد نے خوش نما کو پھر سے اداس کر دیا۔ آنکھیں ڈبڈبایں گئیں۔ اس نے مشکل سے خود کو رونے سے باز رکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو زمین باجی نے کسی لڑکی سے کہہ کر اس کا میک اپ درست کروایا تھا۔ ایک تو رخصتی کے بعد وہ پورے چار گھنٹوں کا سفر کر کے یہاں پہنچی تھی اور ویسے بھی میک اپ کون سا بہت عمدہ ہوا تھا۔ نازو اپنی بھابھی کے ساتھ اسے محلے کے جس بیوٹی پارلر لے گئی تھی وہ بس یونہی ساتھ جیسا کہ چھوٹے شہروں کے پرانے محلوں میں ہونا چاہیے سونے سا گہرا یہ کہ وہ علاقہ لوڈ شیدنگ کی زد میں تھا۔ آدھی سے زیادہ تیاری کے بعد اچانک ہی لائٹ چلی گئی چونکہ لوڈ شیدنگ کا دورانیہ طویل تھا۔ اس لیے فنشنگ پینز لائٹس کی روشنی میں دیے گئے تب اسے پہلی بار اپنی لاپرواہی اور لاتعلقی پہ غصہ آیا۔ جب سے

اس کی شادی طے پائی تھی۔ دل مرا مرا سا تھا۔ اماں کی موت نے ہر چیز سے بیزار تو پہلے ہی کر رکھا تھا اور اسے یہ آنا "فانا" شادی، مزید بوکھلا گئی۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں تھا ہی کیا جو وہ کوئی فیصلہ کرتی۔ سب معاملات تقدیر پہ چھوڑ کر وہ یوں الگ تھلگ ہو گئی جیسے یہ شادی اس کی نہیں کسی اور کی ہو رہی ہو۔ محلے اور خاندان کی عورتیں اس کی شاندار بری اور بارات کے ساتھ آنے والی بیگمات کے بارے میں کیا کیا تبصرے کر رہی تھیں اسے کچھ دلچسپی نہ تھی۔ نازو نے اس کے عروسی لباس اور بیش قیمت زیورات کی تعریف میں کیسے کیسے قصیدے پڑھے۔ اس نے پروانہ کی۔ بت بنی آنے والے وقت کا انتظار کرتی رہی۔

اور تب۔ تب پہلی بار اسے اپنی یہ کوتاہی کھلی۔ "جب شادی کرنی ہی تھی تو ذرا ڈھنگ سے دلہن بھی بن جاتی۔ اب اچھا تماشا لگے گا میرا۔" وہ مایوس تو پہلے ہی تھی، مستقبل سے اب ناامید بھی ہو گئی۔ "ایک تو پہلے ہی تھوڑا کچھ خاص نہیں۔ اوپر سے اس آنکھوں میں بلیویشن نے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے نجانے کیا لپٹا پوٹی کی ہے۔ مجھے اپنی تو نہیں، زمین باجی کی فکر ہے لوگ انہیں ہی باتیں سنائیں گے۔ آخر اپنے دیور کے لیے میرا انتخاب ان ہی نے کیا ہے۔ چلو اچھا ہے، اب بھگتیں اقربا پروری کا خمیازہ بڑا شوق تھا اپنی سسرال میں مجھے کھانے کا۔"

اس نے بے ڈھنگے پن سے آنچل کا پلو گز بھر آگے لٹکالیا۔ کوئی ہاتھ سے پیچھے کرنے کی کوشش بھی کرتا تو میٹھوں کی طرح ٹھونکی نہیں کامیاب نہ ہونے دیتیں۔ باجی کو نازو سے "واردات" کی تفصیل ملی تو انہوں نے معاملہ سلجھالیا۔ گھر آتے ہی پہلے اس کا حشر درست کروایا اور پھر مودی بنوائی۔ اور اب جاتے جاتے وہ اس کی خاصی تعریفیں کر کے گئی تھیں۔ خوشنما کی ساس تو تھیں نہیں نہ ہی کوئی مند۔ رشتے

کی ممانیوں، چچیوں نے خوب تبصرے کیے۔ ملا جلا سارو عمل تھا۔ تعریف بھی، پینڈو ہونے کا ہلکا سا طنز بھی۔ اور یہ جملہ تو تقریباً ہر سسرالی آنٹی نے ادا کیا۔ ”ہاں بھئی، ساس سر پر نہیں، سسرلا تعلق دیور کی منہ چڑھی بھا بھی ہے، اس لیے آئی اپنی مرضی سے اپنے ہی خاندان کی لڑکی ورنہ اپنے نصیب کو کوئی کمی تھی لڑکیوں کی۔ خاندان میں اور خاندان سے باہر ہزاروں رشتے تھے۔ خود لڑکے کے ہی مزاج نہ ملتے تھے۔ اتنی اونچی پسند تھی۔ اب نجانے کیسے بھا بھی نے قابو کیا ہو گا۔“

خوش نما کا کمزور سادل دھڑک دھڑک جاتا یہ بے لاگ تبصرے سن کر۔ اور پھر ایک بار عبس آواز نے ان تمام سرگوشیوں کا گلا گھونٹ دیا۔ ”کیوں پچی کو گھبرائے دے رہی ہو، یوں ارد گرد جھگڑا بنا کر۔“

اس کے سر پہ چڑھی تمام خواتین اپنی اپنی جگہ پہ بیٹھ گئیں۔ باجی نے تعارف کرایا۔

”خوشی! یہ نانو ہیں امی کے بعد ان ہی نے اس گھر کو اور ہم سب کو سنبھالا ہے۔ طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے یہ اتنا لمبا سفر نہیں کر سکیں۔“

اس نے مدھم آواز میں سلام کیا، ایک مشفق ہاتھ اس کے سر پہ ٹھہر گیا اور ڈھیروں ڈھیروں دعا میں لبوں سے برسنے لگیں۔ دعا میں بھی اپنی ہی ایک طاقت ہوتی ہے۔ اسے رکاوٹ تقویت کا احساس ہوا اور سن ہوتے بدن میں زندگی کی نئی لہر دوڑی اس نے مشکور نگاہوں سے نانو کو دیکھنا چاہا۔ آچل کی سنہری اوٹ سے ایک نورانی سا ہیولہ نظر آیا تھا۔

”کون جانے یہ دعائیں کتنی با اثر ہیں۔“

کمرے کی تنہائی اسے پھر سے کمزور کرنے لگی۔ اجنبیت کا احساس ہر احساس پہ حاوی ہو گیا۔

”میرے پلو میں ماں کی دعا تو ہے ہی نہیں۔“ اس بات کا ملال اسے کئی محرومیاں دے گیا۔

ماموں، ممانی، خالو کتنے لوگ جمع تھے وداعی پہ لیکن

کسی کے ہاتھ نے سر پہ ٹھنڈا سایہ نہ کیا۔ کسی کے لبوں نے سدا سکھی رہنے کی نوید نہ سنائی۔ سب کو اس کی رخصتی کی جلدی تھی جیسے ناکارہ اور سڑی ہوئی بدبودار چیز کو لوگ جلد از جلد باہر پھینکنے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ اسے تو آنے والے وقت سے بھی کوئی خوش کن امید نہ تھی۔ اور اس کا خدشہ شاید سچ ثابت ہو رہا تھا کمرے کی سادگی مکین کی سرد مہری کو ظاہر کر رہی تھی۔ اس نے اپنا دھیان ہٹانے کی غرض سے ایک بار گرد و پیش کا تفصیلی جائزہ لینے کا ارادہ کیا۔

کمرہ وسیع بھی تھا اور خوبصورت بھی لیکن کسی بھی طرح ایک نئی دلہن کے لیے بطور خاص تیار کیا گیا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ سیاہ رنگ کی جھلک ہر چیز میں نمایاں تھی جس نے اسے اور متوحش کر دیا۔

ملکے سرمئی ماربل کے فرش کے کناروں پہ سیاہ پٹی کی ٹائلیں نصب تھیں۔ کمرے کے وسط میں مختصر سا

سیاہ قالین گہرے سرمئی ڈیزائن سے سجا عجیب پر شکوہ لگ رہا تھا۔ سفید دیواروں پہ ملکے سرمئی پردے لٹک رہے تھے جن پہ سلور پتیوں کی بلیں اوپر گوبل کھاتی جا رہی تھیں۔ آئرن راڈ کا جدید اسٹائل کا بلیک فرنیچر تھا۔ نازک سی عجیب و غریب ڈیزائن والی چیریز اور ڈریسنگ ٹیبل، آئرن راڈ کا ہی یہ بڑا سا بیڈ تھا، فرنیچر کے گہرے سیاہ رنگ میں سلور کلر کا امتزاج تھا۔

چمکتے ہوئے سلور نازک تے جا بجا نقش تھے دیواروں پہ آرائشی اشیاء مفقود تھیں۔ عقب میں ایک خوبصورت پینٹنگ منگلی تھی تو دائیں طرف کی دیوار پہ چیریز کے عین اوپر نصیب کی تصویر بھی تھی۔ اس نے غور سے تصویر کو دیکھا ایسی ہی ایک تصویر اسے شادی سے پہلے نازو نے بھی دکھائی تھی۔ جسے بے دلی سے ایک نظر دیکھنے کے بعد اس نے پرے کر دیا تھا لیکن اب اس وقت اس چہرے کی تو جیسے شان ہی اور بھی شاید کمرے کے ماحول کا اثر ہو یا پھر اتلا راج ہونے کے بعد تصویر کی خوبصورتی سو گنا بڑھ گئی تھی۔

خوش نما نے حیرت کے ساتھ ایک ایک نقش کا

”اور اب تم سب لوگ جان چھوڑو اس کی ورنہ یہ
یونہی کھڑا بائیں بکھار تار ہے گا۔“
”اوہو کہاں گئی۔“ وہ شاید جیبیں ٹٹول رہا تھا۔
”ہوش میں لانے کی دوا تو رکھنا ہی بھول گیا
بھابھی۔“

”کوئی بات نہیں، میں جوتی سنگھا دوں گی۔“ باجی
نے تسلی دی اور اسے تقریباً ”دھکا دے کر اندر گھسایا۔
”ہائے ہائے بڑے بے آبرو ہو کر اپنے ہی کوپے
میں ہم آئے۔“ اس نے دیہائی دی اور بھابھی اس کی
”تک بندی پہ ہنستی واپس چلی گئیں۔“

”یار! کم از کم آئندہ اتنی دور کے شہر شادی نہیں
کرنی۔“ انگڑائی لیتے ہوئے اس نے عجیب و غریب سا
اعلان کیا جو خوش نما کے سر سے گزر گیا۔

”چار گھنٹے بارات لے جانے میں اور چار گھنٹے واپس
لانے میں، تم نہیں تھکیں۔؟“ کوٹ اتار کے چیر پہ
پھینکنے کے بعد اس کے قریب بیٹھتے ہوئے وہ اس قدر
دوستانہ انداز میں پوچھنے لگا، گویا دونوں کے درمیان
عرصہ کی بے تکلفی ہو۔

”شادی اچھا خاصا بور کام ہے، بے ناں؟“ تصدیق
کی خاطر وہ قدرے جھک کر آپل کی لمبائی جانچنے لگا۔
”اور خاص طور پہ اپنی شادی، بیگانی شادی پہ تو پھر بھی
کوئی نہ کوئی تماشا دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ لیکن یہاں تو
انسان خود تماشا بن جاتا ہے۔“

ابھی وہ اس عجیب سی تعارفی گفتگو پہ الجھ ہی رہی
تھی کہ وہ پھر گویا ہوا۔

”سنا ہے، اب تم خاصی بہتر لگ رہی ہو۔ میرا
مطلب ہے رباب کے کپے گئے میک اپ کے بعد،
لیکن میں سنی سنائی پہ یقین نہیں کرتا۔“

اس کے طویل جملے کے ابتدائیہ میں ابھی وہ خود کو
تسلی دے ہی رہی تھی کہ یقیناً ”نصیب کا مطلب وہ
نہیں جو اسے لگا کہ اچانک اس کے گھونگھٹ الٹا دینے
پہ وہ ہڑبڑا کے رہ گئی، چند سیکنڈ خاموشی سے گزرے۔
اس کے کمرے میں آنے کے بعد یہ واحد لمحات تھے

جائزہ لیا۔ کسی مرد کی اتنی خوبصورت آنکھیں اس نے
تو شاید تصور بھی نہیں کیا تھا شفاف چمکتا سنہری سی
دک لے گورارنگ، خوش وضع پیشانی، گھنے سیاہ بال،
لمبی مڑی ہوئی پلکوں والی چغتائی آنکھیں، خوبصورت
کٹ والے بھرے بھرے لب وہ متحیر رہ گئی۔

شادی سے پہلے صرف ایک جھلک تصویر کی دیکھنے
کے بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ بندہ اچھا خاصا خوش
شکل ہے کل مندی کی تقریب میں نازد کے بے حد
اصرار پر کھڑکی سے باہر جھانک کر اسے دیکھا تو سچ سچ
پزل سی ہو گئی۔

”یہ اتنا شاندار سا شخص اور زمین باجی نے بھلا اس
کے ساتھ کیا کیا، کتنا ظلم ہے یہ۔۔۔“ لیکن تب بھی اتنی
دور سے اسے دیکھنے پر یہ اندازہ وہ نہ کر سکی کہ اس کا چہرہ
اس حد تک وجہ ہے۔

کئی منٹ وہ تنگنی باندھے دیوار پہ نصب تصویر کو
تکتی رہی، باہر سے آئی آوازوں کے قریب آنے پہ وہ
چونک گئی۔ اپنی بے ساختہ حرکت پہ قدرے عجوب سی
ہو کر اس نے سر جھکا لیا۔

”چل بھی نصیب! یہاں تک تو ہم نے پہنچا دیا۔
آگے تیرا نصیب۔“ کسی مرد کی شوخ آواز سے اس کی
گھٹنوں پہ دھری انگلیاں کپکپا گئیں۔

”نصیب یہ بھروسہ رکھنے سے کیا حاصل، بندے کو
کچھ خود ہی حفاظتی اقدامات کرنے چاہئیں یہ دیکھو اس
جیب میں ہائی بلڈ پریشر کی دوا ہے اور اس میں لو بلڈ پریشر
کی گولیاں، ملٹی وٹامن کا سیرپ بھی رکھ لیا ہے تاکہ اگر
دل کو کچھ ہو جائے تو دو گھونٹ لی کر حوصلہ کر لوں۔ آخر
لوڈ شیڈنگ میں تیار کی گئی دلہن کا دیدار کرنا ہے، دل گردہ
مضبوط ہونا چاہیے۔“

”ہائیں۔۔۔“ اس کا کلبجہ دھک سے رہ گیا۔ ”یہ خبر
کس نے نشر کی وہ شرمندگی سے مزید سر جھکا کے رہ
گئی۔

”اچھا اب زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت
نہیں۔“ زمین باجی نے اسے ڈپٹا۔

جب اس کی زبان کو بریک لگی۔ خوشنما اس خاموشی کی وجہ جاننے سے قاصر تھی۔
”یہ تمہاری رونمائی کا تحفہ۔“

”اس کی جھکی نگاہوں کے سامنے دو بھاری کنگن لہرا کر چھٹکانے۔ وہ گود میں دھرے ہاتھ مزید سمیٹنا چاہتی تھی کہ اس نے اس کا ٹھنڈا برف پڑتا ہاتھ تھاما اور کنگن پہننا دیئے، کتنی دیر وہ اس کے ہاتھ دیکھتا رہا خوش نما نے وزر دیدہ نگاہوں سے دیکھا۔

نازدکی کئی ٹوکوں سے رچائی مہندی اس کے نازک کوئل انگلیوں والے گندمی ہاتھ پہ خوب اٹھی تھی۔ مہندی کی گہری سرخی والے نیل بوٹوں سے سجا اس کا ہاتھ خاصا نکھر نکھر الگ رہا تھا۔ بری کی طلائی چوڑیاں سیدھے ہاتھ میں تھیں جب کہ اس کلائی میں کانچ کی سنہری مینا کاری والی میروں چوڑیاں تھیں۔ ان کے آگے نصیب کے پہنائے کنگنوں نے جیسے پوری کلائی سجا ڈالی تھی۔ کچھ دیر تو صفی نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد نصیب نے کہا۔

”اچھا ڈیزائن ہے ناں کنگنوں کا۔ یوں تو میں نے کبھی یہ خالص زنانہ شاپنگ نہیں کی پھر بھی دیکھ لو“ کتنی اچھی چوائس ہے میری۔“

وہ اس کی کلائی کو کسی بے جان چیز کی طرح ادھر ادھر گھماتا ہر زاویہ سے اپنے خریدے گئے کنگنوں کا جائزہ لیتا رہا اور خوش نما کے دل کی آخری امید نے بھی چپکے سے ہار مان لی۔ ان ہاتھوں کے سوا اسے کبھی خود میں کوئی قابل ذکر چیز نظر نہ آئی تھی۔

”لاؤ اب۔۔۔ میرا تحفہ؟“ اس نے اپنی چوڑی ہتھیلی پھیلائی۔ وہ بے ساختہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر شرارتی سی مسکراہٹ دیکھ کر فوراً ہی دوبارہ جھک کر دیکھ سی گئی۔

”بھئی“ یہ رونمائی کا تحفہ ہوتا ہے تو پھر جیسے میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا ہے، تم بھی تو مجھے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ میری منہ دکھائی کی رسم بھی پوری ہونی چاہیے جب تمہیں اتنے مہنگے کنگن مل سکتے ہیں تو پھر ہمیں تو سونے میں تول دینا چاہیے کیوں؟“ وہ اتر اتر کر کہہ رہا

تھا جب کہ وہ جاننے سے قاصر تھی، یہ مذاق تھا یا خود پسندی کا سنجیدہ مظاہرہ
”ارے کہیں تم گونگی تو نہیں۔ مارے گئے یعنی ٹیکنیکل فالٹ بھی ہے۔“

”اس کے“ ”بھئی“ نے تو خوش نما کو جیسے آگ ہی لگادی، چیز کر بولی۔
”جی؟ کیا مطلب؟“

”چلو شکر ہے، اتنا اطمینان تو ہوا کہ آواز سلامت ہے یعنی بالکل اندھیر نہیں پڑا۔“ وہ سکون کی سانس لیتے ہوئے کہنے لگا۔

”اور آواز نہ صرف ہے، بلکہ خاصی مدھرا اور دلنشین سی بھی ہے۔“ اس نے بلاشبہ پچھلے آدھ گھنٹے میں یہ پہلا جملہ اپنی نئی نویلی دلہن کی تعریف میں کہا تھا۔ وہ شرماتے ہوئے دل ہی دل میں مسرور ہو ہی رہی تھی کہ نصیب کا اگلا جملہ اسے سیدھا زمین پر بیچ گیا۔

”اور کیوں نہ ہو، ایسی شکل و صورت والی خواتین کی آوازیں ہمیشہ ہی خوبصورت ہوتی ہیں، شاید خدا اس طرح ہی ازالہ کرتا ہے جیسے تارونا کیلی، شازیہ منظور

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے معروف ناول

- * دل بچوں کی بستی — محبت عبد اللہ — 400/-
- * جو پہلے تو جہاں سے گزرمے — ماہا ملک — 150/-
- * وہ خنجر سی دیوانی سی — آسیہ قریشی — 400/-
- * طائر لاہوتی — رفعت سراج — 550/-
- * ایمان امید اور محبت — عبیدہ احمد — 180/-
- * خواتین کا گھروں کا سائیکلو پیڈیا — 600/-

خوبصورت مرقق، آفٹ پیپر، خوبصورت چھپائی، دیدہ زیب منبجہ جلد

شائع ہو گئے ہیں

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی

لاہور میونسپلٹی

- لاہور اکیڈمی • سلطان نیوز ایجنسی
- عظیم اینڈ سنز • اسلام آباد خانہ
- اردو بازار • لاہور

حیدر آباد میونسپلٹی
مہران نیوز ایجنسی

راولپنڈی میونسپلٹی
اشرف بک ایجنسی

وغیرہ۔ ویسے کبھی کبھی شکل اور آواز دونوں ہی سونے پہ
سہاگہ ہو جاتی ہیں جیسے نصیبو لعل۔“

مرے مرے دل کے ساتھ وہ اس کے اتراے لمبے
کی لن ترانیاں سنتی رہی۔ لباس تبدیل کرنے سے قبل
اس نے ڈرننگ روم میں نصب قد آدم آئینے میں خود
کو جانچنا چاہا۔

”کیا میرے وجود میں کچھ بھی ایسا نہیں کہ وہ اپنی
ذات سے ہٹ کر ایک نظر مجھ پہ بھی ڈال لیتا۔“
اس سوال نے اسے آئینے کے سامنے لا کھڑا کیا
ورنہ پہلے نازو کے اور اب رباب کے تیار کرنے کے
بعد باجی کے کہنے کے باوجود اس نے خود کو دیکھنا گوارا نہ
کیا تھا۔

بھاری میرون شرارے میں ملبوس، فل میک اپ
کے ساتھ وہ خود کو پہچان نہ پائی۔ چہرے کے اطراف
پھیلے بھاری دوپٹے سے زربار شعاعیں پھوٹ کر
سانولے چہرے کو ایک جگہ گامبھیر سی رہی تھیں۔
صبح پیشانی پہ میرون نگوں والا گولڈن میک اپ جموئی سی
ناک میں انکی چاند کے ہالے جیسی نازک سی نتھ لانی
گردن میں جزاؤ گلو بند دونوں ہاتھوں میں بھر بھر پسنی
طلائی اور کالج کی چوڑیاں اس کے دلہنایے کو مکمل
کر رہی تھیں۔ اس نے ذرا قریب سے خود کو دیکھنا
چاہا۔

”نہ تو رونا لیلیٰ کی سی سیاہ پکی رنگت ہے نہ شازیہ
منظور والی گول شیشوں کی عینک نہ ہی لتا منگیڈشکر کی
طرح چہرے پہ چچک کے نشان، پھر کیا سوچ کر اس نے
مجھے ”ایسی صورتوں“ میں شمار کیا۔ اگر اتنی لیپا پوتی اور
مصنوعی چمک دمک کے سہاروں کے ساتھ بھی میں
اسے ایک آنکھ نہیں بھائی تو پھر مجھے سمجھ جانا چاہیے
کہ کل صبح منہ دھونے کے بعد میرے چہرے کے
میک اپ کے ساتھ ساتھ نصیب کی وقتی مروت بھی
بہہ جائے گی۔“

♥ ♥ ♥ ♥
”محترمہ خشک نما۔۔۔ خشک نما۔۔۔“

اسے سوتا ہوا چھوڑ کر وہ ابھی واش روم گئی تھی۔

رات کو کلہنژنگ ملک سے میک اپ صاف کر دینے
سے اسے کوئی خاص تسلی نہ ہوئی تھی۔ اس وقت وہ
صابن کے جھاگ اڑاتے ہوئے رگڑ رگڑ کر چہرہ دھو رہی
تھی کہ دروازہ دھڑ دھڑپینے کے ساتھ وہ خود بھی بلند
آواز میں اسے پکارنے لگا۔ گھبرا کر دو تین چھپا کے
مارتے ہوئے اس نے چہرہ صاف کیا اور دروازہ کھول
دیا۔ وہ سامنے کھڑا جمائی لے رہا تھا۔

”تنی دیر سے میں۔۔۔ ہیں۔۔۔؟ یہ تم شیو کر رہی
تھیں؟“ اس کے بے تگے سوال پہ خوش نما گڑبڑا گئی،
پلٹ کر بیسن کے اوپر لگے آئینے میں چہرہ دیکھا، جلدی
میں صحیح طرح پانی سے صاف نہ کرنے کی وجہ سے
اچھی خاصی جھاگ ٹھوڑی اور کانوں کے پاس لگی ہوئی
تھی۔ جھل سی ہو کر وہ دوپٹے کے ساتھ چہرہ رگڑنے
لگی۔

”وہ میں میک اپ صاف کر رہی تھی۔“
”دھو رہی تھیں یا کھرچ رہی تھیں۔ خیر جو بھی کرنا
ہے ذرا جلدی کرو بھالی نے اعلان کر دیا ہے آج سے
مجھ اکیلے کو ناشتہ ہر گز نہیں ملے گا۔ اب تم ڈانگنگ
نیمبل کو رونق بخشو گی تو مجھ غریب کو کچھ کھانے کو ملے
گا۔“

وہ بال سکھانے کے بعد دوپٹہ پھیلا کر کمرے سے
نکلنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ نرمین باجی آگئیں۔ ساتھ
ہی ایک ہنسی مسکراتی خوش باش سے چہرے والی لڑکی
بھی تھی۔

”رباب! تم اسے جلدی سے تیار کرو، میں ذرا کچن
میں دیکھوں، ناشتہ کہاں تک پہنچا۔ اور ہاں وہ لائٹ
پنک سوٹ نکالنا، ساتھ میں کوئی لائٹ سائیڈ۔“
عجلت میں اسے ہدایت دیتی وہ نیچے اتر گئیں۔ اس نے
پسندیدہ نظروں سے رباب کو دیکھا۔

”تو یہ ہے نصیب کی وہ خالہ زاد جس نے کل مجھے
تیار کیا، افسوس بے چاری کی محنت ضائع گئی۔“

کل باجی نے تعارف تو کروایا تھا مگر لہن بنی خوش نما
اسے دیکھ نہ پائی تھی، اب سادہ سے انداز میں مسکراتی
وہ لڑکی اسے پہلی ہی نظر میں اچھی لگی۔ رباب کی

آنکھوں میں بھی اس کے لیے پسندیدگی تھی۔

”واؤ بھابھی! آپ کی اسکن کتنی فریش اور لائو ہے۔ کتنی شائے ہے آپ کے بالوں میں، سچ کہوں رات سے زیادہ آپ اس وقت اچھی لگ رہی ہیں۔“ اس کی پونی کھول کر اس نے شانوں تک آتے ہلکے گھنگھریالے بال پھیلا دیے۔

”ایسے زیادہ بچ رہے ہیں۔ اور میک اپ سے تو آپ کی اسکن کی ساری خوبصورتی ہی چھپ جاتی ہے بس یہ مسکارا اور یہ لائٹ پنک لپ اسٹک ہی ٹھیک ہے۔“ اس نے جارحانہ کے سبز کڑھائی والے سوٹ سے ہم رنگ لپ اسٹک نکالی تو خوش نما گھبرا گئی۔

”نہ نہ۔ نہیں۔ یہ کلر نہیں۔ اتنے لائٹ شیڈ کی لپ اسٹک سے میرا رنگ دبا دیا لگے گا۔“

”ایویس ہی۔ میں باقاعدہ یونیٹیشن ہوں جناب، چہرے اور رنگت کے حساب سے ہی میک اپ کرتی ہوں، تیز رنگوں کی ضرورت پھیلے کو پمپلشکشن والی لڑکیوں کو ہوتی ہے کیونکہ زیادہ سفید رنگت ہلکے میک اپ کے ساتھ آڑی آڑی سی لگنے لگتی ہے۔“

اس کے انکار کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ اپنا کام کرتی رہی۔ آنکھوں کو بلیک لائن اور مسکارے سے نمایاں کر کے، لبوں پہ ایک تہہ گلوری شائن والی لپ اسٹک کی لگائی، تھوڑے سے فیس پاؤڈر کے پف کے ساتھ میک اپ مکمل ہوا۔

”یہ لیجئے نہ چہرے کی رنگت یکساں دکھانے کے لیے فاؤنڈیشن لگانا پڑا نہ ہی جھائیاں، حلقے چھپانے کے لیے کنسیملر استعمال کرنا پڑا نہ ہی مصنوعی چمک کے لیے ہائی لائٹر ضائع کرنا پڑا۔“ خوش نما ہولے سے مسکرا دی۔

میروں چوڑیاں اتار کے اس نے میچنگ کی چوڑیاں پہنائی چاہیں تو اس نے منع کر دیا۔

”بس یہ کنگن ٹھیک ہیں۔“

”ارے یہ تو میں نے دیکھے ہی نہیں، اچھا اچھا۔ نصیب بھائی کا تحفہ ہو گا۔ ہاں بھئی، اب آپ کو کچھ اور کہاں جے گا ان کلائیوں میں۔“

سفید ٹنگوں والی جھمکیاں، گلے میں نانو کی دی گئی چین پین کروہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈائنگ روم میں اس نے سب کو فردا فردا سلام کیا۔ حبیب بھائی، بچے، ابا جی اور نانو سمیت سب ہی موجود تھے۔ نصیب کی خالہ یعنی رباب کی امی آنٹی نور جہاں بھی تھیں۔

”ماشاء اللہ دلہن یہ روپ تو بڑا چڑھا ہے۔“ وہ حیرت سے آنٹی کو دیکھنے لگی۔ یہ ماں بیٹی کو دوسروں کا دل رکھنے کی عادت ہے یا پھر ان دونوں کا معیار حسن ہی اتنا کمزور سا ہے۔

”شکر ہے، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، تم آگئیں۔“ دوسرے دروازے سے اندر آتے نصیب نے والہانہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”سوچکر لگا چکا ہوں تمہارے انتظار میں یہاں سے وہاں تک لیکن تمہیں شاید آتش شوق بھڑکانے میں مزا آتا ہے۔“ اس کے بے باک انداز پہ وہ جھینپ گئی۔

”اب تمہیں دیکھا ہے تو جان میں جان آئی ہے، مچلتے دل کو قرار ملا ہے۔“ اس نے سٹپا کر اپا جی اور نانو کو دیکھا پھر اسے۔ (تنہائی میں تو اپنے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا، اب اتنے لوگوں میں کس لیے کھلم کھلا بے تابی دکھا رہے ہیں۔)

”شکر ہے اب ناشتہ تو ملے گا۔ بھالی! آگئیں آپ کی دیورانی، خدا کا واسطہ ہے اب تو کچھ کھانے کو دے دیں۔“ اگلے ہی لمحے اس کی بے تابی کی وجہ سامنے آگئی۔ اپنی خوش فہمیوں کو زور سے ڈپٹ کر کونے لگانے کے بعد وہ چپ چاپ سلاٹس کترنے لگی۔

ناشتے کے بعد سب اسے گھیر کر بیٹھ گئے۔

”بھالی! آپ کانٹاں (نام) بوت سونا ہے۔ مجھے اپنا
ناں پسند نہیں۔ دراصل میری بے بے کو سلطان راہی
بہت پسند تھا وہ کہتی تھی پتر ہوا تو ناں سلطان راہی
رکھوں گی پر اس کو نری بیٹیاں ہی ہوئیں۔ چو تھی
واری میں ہوئی تو اس نے چڑ کر میرا ناں انجمن رکھ دیا کہ
شاید میرے ناں کے بچے سلطان راہی بھی آجائے پر
ناں جی۔۔۔“ وہ تیل سے بھرا براسا سر ہلانے لگی۔

”یہ جو نصیب پائی جان ہیں ہر کے کانٹاں وگاڑتے
ہیں۔ مجھے انجمن نہیں من دو من کہتے ہیں۔ بو بے کو
کہا کہتے ہیں۔ رباب باجی کو کباب، منظر کو بندر، وڈی
بھالی ہو راں کو غمگین بھالی کہتے ہیں پر آپ کانٹاں کیسے
وگاڑیں گے اتنا پارا ناں۔۔۔“

تب ہی اسے نصیب کا صبح سویرے پکارنا یاد آگیا۔
”خٹک نما۔۔۔“

صبح اپنی رو میں اس نے توجہ نہ دی تھی اب ساری
بات سمجھ میں آگئی اور اس سے اس رعایت کی توقع
نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ سب کے سامنے اس فضول
سے نام سے پکارنے سے پرہیز کرے گا۔

”چلو اب ہٹو بھی، جم گے ہی بیٹھ گئی ہو۔ جاؤ وہ ڈھیر
برتنوں کا دھوؤ۔“ خالہ نور جہاں نے اسے ہٹانا چاہا۔
”بیٹھے رہنے دیں ناں ملکہ ترنم۔۔۔ آپ کا کیا لیتی
ہے بچاری۔“ نصیب نے اس کی سائیڈ لی پھر پلٹ کر
دوسرے ملازم کو آواز دی۔

”ہاں بھئی محبوب! عرف بو با عرف کہا! تم کیوں دور
کھڑے شرماتا کر شیم آرا بننے کی کوشش کر رہے
ہو، آگے آؤ، کہیں تمہارے دل میں کوئی حسرت نہ رہ
جائے۔ تعارف کی۔“ منجی سا بو با شرماتے لجاتے
آگے بڑھا اور منمنائی آواز میں سلام کر کے پلٹ گیا۔

”بھالی جی! یہ کڑے پائی جان نے دیے ہیں۔ میں
صدقے کتنے اچھے ہیں۔“

”بو بے! ذرا اس من دو من کو پچھلے خالی پلاٹ میں
پھینک آؤ۔“ نصیب کے آرڈر پر وہ گنگنوں کی تعریف
کرنا بھول گئی۔

”ہائے ہائے کیوں خیری صلا۔“

تصدیق چاہی۔
”یہ اب تمہاری خالہ نہیں، چچی ہیں۔“ باجی نے
اطلاع دی۔

”تو پھر خالہ کہاں گئیں؟“ بلبیل پوچھنے لگی۔
”اسے میں نے کھالیا۔“ نصیب نے اطمینان سے
کہا۔

”ہٹو رے جی سارے۔“ ایک موٹی تازی سانولی
سی نو عمر لڑکی جو یقیناً ملازمہ تھی آگے بڑھی۔
”پہلاں، میرا تارف (تعارف) کراؤ باجی ہو راں
سے۔ میرا نیم ختم ہونے والا ہے۔“

”تم تو ایسے کہہ رہی ہو من دو من! جیسے دنیا میں
تمہارا وقت تمام ہو چکا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ
تمہاری باجی ہو راں نہیں بھالی ہو راں ہیں اگر
تمہارے دلی جذبات کو کوئی شخص نہ پہنچتی ہو تو۔۔۔“
نصیب نے تصحیح کی۔

”کیا جی! کس کو کیا نہ پہنچتی ہو؟ میں کیوں نہ بھالی
کہوں گی۔ سو سو باری کہوں گی۔“ الفاظ اس کے سر
پر سے گزر گئے تھے لیکن بات بہر حال سمجھ میں آگئی
تھی۔

”سو سو دفعہ کہنے سے کیا تمہیں زیادہ تنخواہ مل
جائے گی۔ کیا اور ٹائم لگانے کا ارادہ ہے۔؟“

”نہیں تے ناں سی، میں آپے بتاتی ہوں بھالی جی
کو، میں ناں جی انجمن ہوں انجمن اتی سی تھی جب
سے یہاں کام کر رہی ہوں۔“ اس نے انگوٹھے اور
انگشت شہادت سے انچ بھر کا اشارا کیا۔ سب کے
ساتھ ساتھ اسے بھی ہنسی آگئی البتہ نصیب نے ٹوک
دیا۔

”خدا کا خوف کرو من دو من! اتی سی تو تم کبھی بھی
نہیں رہیں۔ ہاں اتنی ضرور تھی جب ہمارے گھر آنا
شروع ہو میں۔ اس نے تین سالہ بلبیل کی طرف
اشارا کیا۔

”اور یہ بھی جھوٹ ہے کہ تم تب سے یہاں کام
کر رہی ہو۔ تب تمہاری اماں یہاں صفائی کرتی تھیں
اور تم صفایا۔۔۔ فرج سے، بچن سے۔۔۔“

”خود ہی تو کہہ رہی ہو میں صدقے اور صدقے کی چیزیں کوئی گھر میں تو رکھتا نہیں باہر پھینکتے ہیں۔“
 ”آپ بھی ناں پائی جان ہر ویلے محول (مذاق) ہی کرتے رہتے ہیں۔ ہاں بھابھی جی میں کہہ رہی تھی یہ جو کڑے ہیں بالکل ویسے ہی ہیں جیسے صبحہ (صائمہ) نے فلم میں پننے تھے اور وہ گانا گایا تھا۔“

گل سن دے بجن دیا کنگنا
 چونڈی وڈ (چنگلی بھر کے) کر مینوں تنگ نا
 بھالی جی! یہ بھی چونڈی تو سنیں وڈتے؟
 ”نہیں لیکن پائی جان زیادہ بگ بگ کرنے والوں کی
 ”تون وڈتے“ (گردن کاٹتے) ہیں۔“ اس بار اس کے
 دھمکانے پر وہ سچ مچ ڈر کے بھاگ گئی۔

”بیٹی! تم تو کچھ بولتیں ہی نہیں کب سے ایسے
 چپ چاپ بیٹھی ہو۔“ نانوں نے پیار سے اسے مخاطب
 کیا۔

”بھالی کی آنکھیں جو بولتی ہیں انہیں کیا ضرورت
 ہے الفاظ ضائع کرنے کی۔“ یہ رباب کی رائے تھی۔
 ”قسم سے اتنی پیاری آنکھیں۔“

”کہاں ہیں؟ کہاں ہیں؟“ نصیب اخبار چھوڑ
 چھاڑ اس کے قریب آ بیٹھا وہ گھبرا اٹھی۔

”کہاں ہیں؟ مجھے بھی دکھاؤ۔ اچھا وہ وہ
 رہیں۔“ وہ کولمبا کھینچتا ہوا وہ آنکھیں سکڑ کر اس کے
 چہرے پر کچھ ڈھونڈنے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔ باجی نے
 ایک دھپ پیچھے سے اس کی کمر پہ لگائی۔

”تو نکلی۔ ڈرامے بان۔ ایکٹر ہے پورا۔“
 ”مجھے تو لگ رہا ہے دلہن کی شکل کسی ایکٹریس سے
 ملتی ہے۔ نہیں نہیں۔ ایکٹریس سے نہیں ماڈل
 سے۔“ خالہ نور جہاں نے نیا شوشہ چھوڑا۔ ”وہ کس
 اشتہار میں آتی ہے بھلا؟“

”ڈٹرنٹ کے اشتہار میں۔“ جواب نصیب نے
 دیا۔ ”وہی ناں خالہ جو بڑی مسرت کے ساتھ اعلان
 کرتی ہے کہ اب اس کا شو ہر چاہے نہاری کھا کر پلیٹ
 کرتے کے دامن سے پونچھے چاہے گولہ گذا تمیص
 کے گلے پہ گرا ڈالے چاہے سائیکل کی گریس نئے

ریشمی تہبند سے صاف کرے۔ اب کوئی غم نہیں۔
 کیونکہ صفا چٹ ڈٹرنٹ میرے میلے کچیلے شوہر کے
 غلیظ کپڑوں کے ساتھ ساتھ کالی بھنگ و پیچیسوں کی۔
 کالک بھی صاف کر ڈالتا ہے۔ ڈنگ ڈانگ۔ خوب
 یاد دلایا خالہ! آپ نے بالکل ملتی ہے شکل۔“

وہ اتنے سارے لوگوں کے تہقنوں کے جواب میں
 لب کھلتی رہی۔ دل تو چاہ رہا تھا۔ ابھی اور اسی وقت
 محفل سے اٹھ کے چلی جائے لیکن۔ کیسے۔ کس
 برتے۔ وہ اتنا طنطنہ دکھاتی، نانو شاید اس کی کیفیت
 بھانپ گئیں۔ باجی کو اشارا کیا کہ وہ اسے کمرے میں
 لے جائیں۔ وہاں سے نکلتے ہوئے اس نے نانو کو
 نصیب سمیت سب کھی کھی کرنے والوں کو ڈانٹتے سنا۔
 ”ہم تو بس یونہی ہنس پڑے نانو! نصیب بھائی نے
 بات ہی ایسی کی۔“ رباب دبے دبے انداز میں بولی۔
 ”یہ تو ہے ہی بد تمیز۔“

”کمال ہے ذرا ساندھاق ہی تو کیا ہے۔“
 ”ہنسی مذاق کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے، موقع محل
 ہوتا ہے۔ یہ تو دیکھو اس کی پہلی صبح ہے اس گھر میں
 گھلتے ملتے کچھ دن لگیں گے۔ رفتہ رفتہ تمہارے
 اونگے بونگے مذاق کی بھی عادی ہو جائے گی۔ ابھی کچھ
 دن تو بخش دو۔ لے کر درگت بنا کر رکھ دی بیچاری بچی
 کی۔“

”مجھے کیا ضرورت بنانے کی۔ محترمہ ”ریڈی میڈ“
 ہیں۔“ باجی کے دروازہ بند کر کے واپس پلٹنے تک وہ
 نصیب کا یہ جملہ بھی سن چکی تھی۔ جو اس کے
 آنسوؤں کے بند توڑنے میں خاصا مددگار ثابت ہوا
 تھا۔

یہ رونا ”سکنا“ اس کے لیے نئی بات تو نہیں تھی۔
 فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ پہلے ہر چوٹ پہ وہ اماں کی گود
 میں منہ چھپا کے رویا کرتی تھی۔ جب اماں نہ رہیں
 کوئی اس کے اشک پونچھنے والا بھی نہ رہا۔ پھر نجانے
 کیسے نرمین باجی آگے بڑھیں۔ اسے اُمید کا ایک جگنو
 تھمایا اگرچہ وہ خوش فہم تو کبھی بھی نہ رہی تھی لیکن بندہ

بشر تو تھی، سول کے کسی کو نے میں ڈرتے جھجکتے
 ذرا سی امید بھی روشن کر بیٹھی اب نصیب کا رویہ اس
 آخری امید کا بھی قابل ثابت ہوا، اس لیے آج اس
 کے رونے میں عجیب ہی دل شکستگی اور بے بسی تھی۔
 ہوش سنبھالتے ہی اس نے خود کو اماں کے ساتھ
 ماموں کے در پر بڑا دیکھا اور ماموں بھی سوتیلے، سگے
 بھائی بھی شاید ہی کشادہ دلی سے کسی مطلقہ بہن کو عمر بھر
 کے لیے سر پر سوار کرتے ہوں اور یہاں تو سوتیلے پن
 کی رعایت بھی تھی لیکن۔ دنیا دنیا داری بھی تو کوئی
 چیز ہے۔ آخر بھی تو بہن۔

طلاق کے بعد بھی سمیت شوہر نے تو گھر سے نکال
 دیا۔ بھائی کیسے نکالتے، آخر اسی دنیا میں رہنا ہے، اسی
 خاندان میں بسنا ہے۔ سو سو باتیں سننے کے بجائے بہتر
 تھا کسی نہ کسی طرح دل پہ جبر کرتے ہوئے گھر کے کسی
 کو نے میں ڈال لیا جائے۔ دنیا والوں کی زبان تو بند
 ہوگی۔ گھر کی چار دیواری کے اندر بھلے ہی ٹھوکروں کی
 زد پر رکھیں، جھوٹے برتن چٹائیں، اس بات کی دنیا کو
 فکر نہیں۔ اب کوئی سوال نہ کرنے آئے گا۔ الٹا واہ واہ
 ہی ہوگی۔ یہ سوچ کر دونوں ماموں بہن کو لے ہی
 آئے۔ بیویوں کو بھی سمجھالیا۔ (خاصی شرطوں کے
 ساتھ) اور ہر ہر شرط ممانیوں نے اپنے پورے مفاد میں
 رکھی۔

سر پہ چھت دینے اور دو وقت کی روٹی (کیسی بھی)
 کے علاوہ کسی چیز کی ذمہ داری نہ لی۔ اتنی مہربانی ضرور کی
 کہ شرط سے انحراف کرتے ہوئے اپنی اور بچوں کی
 اترن بھی عنایت کر دی جاتی جس نے اماں کو خوش
 گمانیوں میں مبتلا کر دیا وہ سمجھنے لگیں کہ شاید شرائط
 میں لچک کی گنجائش ہے۔ اسی برتے پہ خوش نما کے
 پانچ سال کا ہونے کے بعد بھائیوں سے اسے اسکول
 داخل کر دینے کی فرمائش کر بیٹھیں۔ اس قدر بھونچال
 آیا کہ مانو سر پہ رکھی چھت تک اڑنے لگی۔ بوکھلا کر وہ
 فوراً کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے توبہ توبہ کرنے لگیں
 لیکن دل کو کیسے مارتیں، بھائیوں کے بچوں کو روز صبح
 صاف ستھرے یونیفارم میں چمکتے شوز کے ساتھ بیگ

اٹھائے اسکول جاتے دیکھتیں تو فرش پہ بیٹھی ناکارہ اور
 فضول سی چیزوں کے ساتھ لپکتی بیٹی کے سامنے اپنا
 وجود مجرم لگنے لگتا۔

اس کے کھلونے ایسے ہی ہوتے تھے۔ پشوری ختم
 ہوئے سیل، بسکٹ کے خالی ڈبے، بال پوائنٹ کے
 ڈسکن، بوتلوں کے ڈسکن۔ ایسا ہی عجیب ساحلیہ
 بھی ہوتا، شامکے کے رانے فراک جو اس کے ٹخنوں
 تک آتے، کبھی رینا کی شلوار جو گھٹنوں سے ذرا ہی نیچے
 ہوتی، توید کی ٹھسی ہوئی نیکریں۔

انہی دنوں اماں کی چچا زاد بہن کویت سے مستقلاً
 لاہور منتقل ہو گئیں۔ ان کے لیے تو جیسے ہارون اور سجاد
 بھائی ویسے ہی خوش بخت بہن، بچپن میں اور لڑکپن
 میں خاصی دوستی بھی رہی دونوں میں پھر شادی کے بعد
 وہ کویت اور یہ پہلے سرال اور اب اس جہنم کدہ میں
 آکر بس گئیں۔ ناجور ان کے حالات جان کر اور سب
 سے بڑھ کر خود ان کی کم ہمتی دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔
 سخت ست سناتے ہوئے انہیں شرم دلائی۔

”وہ تو فرعون بنے بیٹھے ہیں، سگے سوتیلے میں الجھ کر
 یہ فراموش کر بیٹھے ہیں کہ خون تو تم میں بھی اسی باپ کا
 ہے جس کا نام ان کے ناموں کے آگے لگا ہے۔ شوہر
 بھی تمہارا بے غیرت نکلا جو بیوی کے ساتھ ساتھ
 معصوم بچی کو بھی گھر سے باہر نکال دیا۔ لیکن میں
 پوچھتی ہوں تمہاری اپنی متا کہاں گئی؟ کس قدر سکون
 سے تم اپنی اکلوتی اولاد کو روتے دیکھ رہی ہو۔ ذرا اس کا
 حال تو دیکھو۔ سنا تھا باپ مرجائے تو اولاد پل ہی جاتی
 ہے۔ ماں مرے تو ڈل جاتی ہے۔ مجھے لگتا ہے تم مر چکی
 ہو۔ تمہارا ہر احساس، ہر ذمہ داری مر چکی ہے۔ باپ
 شوہر اور بھائی کے بعد دنیا ختم تو نہیں ہو جاتی۔ تم چاہو تو
 خود اپنی بیٹی کی ڈھال بن سکتی ہو۔“

”میں کیا کروں، اکیلی عورت بڑی کمزور ہوتی ہے،
 اس نے بھی کل کو جوان ہونا ہے کہاں خوار کرتی پھریں
 اسے۔“

”میں نے کب کہا کہ تم یہاں سے نکلو، یہ تمہارے
 باپ کا گھر ہے تمہارا پورا حق ہے کس کی ہمت جو

تمہیں یہاں سے نکالے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تم خود کچھ ہاتھ پیرہا کے انجی بچی بالو بغیر اچھی خوراک لباس اور سب سے بڑھ کر تعلیم کے بغیر اسے پال کر تم اس پر کیا احسان کرو گی۔

بات تو خوش بخت کے دماغ میں آگئی لیکن راستہ نہ بچائی دیا۔ تعلیم ایسی خاص نہ تھی ملازمت کرنے سکتی تھیں برتن مانجنے پہ بھی راضی تھیں۔ لیکن بھائیوں کی غیرت اور خاندان کی عزت آڑے آتی تھی۔ یہاں بھی تاجور نے مدد کی۔ وہ اپنا بوتھک شروع کر رہی تھیں جانتی تھیں کہ خوش بخت سلائی جانتی ہیں اس لیے اپنے کئی آرڈر دے ڈالے۔ اتنے سالوں تک بھائیوں اور ان کے بچوں کے لیے ڈھیروں ڈھیر کپڑے سی سی کر اب ہاتھ میں اور صفائی آچکی تھی۔

کئی بار سوچا کہ اگر بھابھیاں تھوڑی بہت اجرت دے دیا کریں تو۔۔۔ لیکن کہنے کی بہت نہ کی اشارے کنائے سے محلے کے لکھروں کے کپڑے سینے کی اجازت ضرور طلب کی جسے خاصے غنیض و غضب کے مظاہرے کے بعد رد کر دیا گیا۔ تاجور کی مدد خاصی امید افزا تھی۔

خوش نما کی تربیت میں بھی بروقت تبدیلی آگئی اسکول جانے اور ماں کے خود مختار ہونے کے احساس نے اسے اعتماد بخشا شروع کر دیا۔ اب کٹ پیس سے بھی سہی مگر ماں اس کے لیے نئے کپڑے سیتی تھیں۔ سستے ہی سہی مگر کھلونے ہوتے تو تھے انگلش میڈیم اسکول میں دین میں بیٹھ کر بھلے نہ جاتی تھی لیکن پیدل چل کر سرکاری اسکول میں بھی اس نے تعلیم و ذہانت کے وہ ریکارڈ قائم کیے جو ماموؤں کی اولادیں کئی سہولیات ہونے کے بعد بھی حاصل نہ کر پا رہی تھیں لیکن ایک احساس سے وہ نجات حاصل نہ کر پائی تھی۔ اور وہ نہ باپ سے محرومی تھی اور نہ اس کے حوالے سے ماں کو ملنے والی ذلت کوئی اولاد کی وجہ سے بیوی چھوڑتا ہے کوئی دوسری عورت کے چکر میں پڑے۔ کوئی جینز کے لالچ میں۔۔۔

اس کی ماں کا قصور کم صورتی تھا۔ کشمیری خاندان

سے تعلق رکھنے والے، وجہہ باپ اور حسین و جمیل سی ماں کے ہوتے ہوئے بھی انہوں نے نجانے کس کے نقش لیے تھے۔ تنگ پیشانی، قریب قریب گلی چھوٹی اندر کودھنسی بٹن نما آنکھیں، باہر کو نکلے دانت جن کی وجہ سے وہانہ بھی پھیلا پھیلا سا لگتا۔ موٹی بیٹھی ہوئی ناک اور تھوڑی پہ بد نما سامتہ، شکل سے ہی وہ کرخت سی بد مزاج عورت نظر آتیں لیکن یہ تو ان کو قریب سے جاننے والے جانتے تھے کہ اس بد ہیئت اور بے کشش وجود میں کس قدر حسین فطرت چھپی ہوئی ہے۔ خوش نما کو اماں سارے جہاں سے پیاری لگتیں پھر بھی وہ یہ سوچتی ضرور۔

اماں کا رنگ تو صاف ہی ہے بدن بھی دبلا پتلا ہے اگر آنکھیں ناک اور ہونٹ بھی خوبصورت نہ سہی مناسب ہی ہوتے تو اماں کتنی اچھی لگتیں یہ دانت بھی ٹھیک ہو سکتے تھے اور مسہ بھی غائب کروا دیا جاسکتا تھا اس کے اپنے نقش اپنی اپنی جگہ مناسب و موزوں تھے لیکن قسمت۔۔۔ کہ رنگ اس نے باپ کا لیا، سانولا۔۔۔ جس کی وجہ سے ماموؤں کے گورے چٹے موٹے نازے کشمیری بچوں کے درمیان وہ سیاہ دھبہ محسوس ہوتی۔ سب اسے کالو کہہ کر پکارتے۔ جیسے جیسے اس کا قد نکلتا گیا۔ رنگ صاف ہو گیا۔

نقوش کی دلکشی مزید کھل کے سامنے آگئی۔ سرپا بھی بڑا سبک سا تھا لیکن اماں کے حوالے سے شکل و صورت کا یہ کامیلیکس اس کے دماغ سے نکل نہ سکا۔ کالج جانے کے بعد بھی یہی حال رہا۔ فرینڈز اکثر کہتیں۔

”ہائے خوش نما! تمہارے ہاتھ کتنے پیارے ہیں نازک نازک سے۔“

”یار! تمہاری اسکن بہت ملائم ہے، کیا لگاتی ہو۔۔۔؟“ یا پھر۔۔۔

”یہ کلر اچھا لگ رہا ہے تم پہ۔۔۔ لیکن یہ کوئی نہ کہتا۔۔۔“ خوش نما! تم کتنی خوبصورت ہو، تم ہر رنگ میں اچھی لگتی ہو۔“

اور کیوں کہتا، کالج میں ایک سے ایک حسین لڑکی

موجود تھی۔ کسی کے بال گھٹاؤں جیسے تھے تو رنگ میں گلابیاں گھولنے میں بھی قدرت نے فیاضی سے کام لیا تھا۔ کسی کے لب یا قوتی تھے تو نیلم سی آنکھیں اور چار چاند لگاتیں جب کہ وہ بس ٹھیک ہی تھی۔

تاجور آنٹی کا پاکستان آنا شاید اس کے لیے غیبی امداد تھی، اماں کے گزر جانے کے بعد بلاشبہ وہ بے حد اکیلی رہ گئی تھی لیکن پھر بھی یہ سوچ سوچ کر لرز جاتی کہ اگر خداخواستہ تاجور آنٹی نے اماں کی ہمت نہ بندھائی ہوتی تو آج اماں کے بعد ماموں کے گھر کی باورچن اور جمعہ ارنی وہ ہوتی۔

اماں جاتے جاتے اسے تعلیم کی مضبوطی عطا کر گئی تھیں۔ ان کی انتھک محنت نے اسے ایم اے کروا بھی دیا تھا لیکن افسوس رزلٹ آنے سے پہلے ہی اماں گزر گئیں۔ بہن کو تو پھر بھی کسی نہ کسی طرح برباد کر لیا تھا لیکن اس کی یہ بیٹی سراسر ناکارہ وجود تھی۔ جو نہ تو مفت میں پڑے ہوئی تھی نہ ہی درجنوں افراد کے لیے روٹیاں پکالتی تھی۔

یہاں بھی تاجور آنٹی کام آئیں وہ اسے اپنے ساتھ لے آئیں۔ تسلی دینے میں انہیں کمال حاصل تھا روتی بلکتی خوش نما کو چند دنوں میں اس حالت تک تو وہ لے آئیں کہ وہ اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچنے کے قابل ہو گئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ رزلٹ آنے کے بعد وہ کوئی جاب کر لے گی۔ چاہے کم تنخواہ والی ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا خرچہ ہی کتنا تھا ابھی وہ یہ پلاننگ کر ہی رہی تھی کہ تاجور آنٹی کی بڑی بیٹی زمین باجی نے دھماکا کر دیا۔

وہ ماں سے بڑھ کے فلاحی منصوبہ لائیں۔ اپنے اکلوتے اور کماؤ دیور کا رشتہ یتیم و مسکین بے آسرا سی خوشنما کے لیے لا کر وہ ہرگز تیار نہ ہوتی لیکن تاجور آنٹی کی ایک ہی بات نے اسے تھکا کر ایک طرف بٹھا ڈالا۔

”بیٹا! میں بھی بہوؤں والی ہوں، تمہاری ماں تمہارے ماموؤں کی سگی بہن نہ تھی اس لیے تم اس کا حال دیکھ چکی ہو، تم بھی میرے بیٹوں کی دور پرے کے

رشتے سے بہن لگتی ہو۔ میں جب تک ہوں، چاہے کس دل سے بھی سہی وہ تمہیں برباد نہ کر لیں گے لیکن میرے بعد ذرا سوچو کیا تم وہ زندگی گزارنا چاہو گی جو خوش بخت۔“

”نہیں لیکن آنٹی! اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ میری شادی کے بعد زندگی بہت آسان ہو جائے گی؟ اس گھر میں میرے لیے خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔“

”کوئی گارنٹی نہیں۔“ آنٹی نے صاف گوئی سے کہا۔ ”لیکن اُمید تو ہے، یہاں تو یہ بھی نہیں۔ اور پھر وہاں عزت بھی ہوگی جو یہاں معدوم ہے۔ کل کلاں کو کوئی بھی بہو تمہارے، یعنی ایک جوان جہاں غیر لڑکی کے یہاں رہنے پہ اعتراض کر سکتی ہے جو تمہارے لیے ذلت کا باعث ہوگا اور پھر سو فیصد نہ سہی۔ اتنی گارنٹی تو میں دے سکتی ہوں کہ تمہیں وہاں عزت ملے گی۔ آخر میری اپنی بیٹی کی سرال ہے۔ سالوں سے جانتی ہوں اگر تمہیں میرے خلوص پہ شبہ ہے تو یہ سوچو جہاں اپنی بیٹی دے سکتی ہوں وہ غلط جگہ تو نہیں ہوگی۔“

”نہیں آنٹی۔۔۔! آپ کے خلوص پہ مجھے کوئی شک نہیں۔۔۔ لال۔۔۔ لیکن زمین باجی تو اکثر۔۔۔ میرا مطلب ہے اپنے سرال۔۔۔“

”ہاں وہ۔۔۔“ انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”تم میں اور زمین میں بہت فرق ہے بیٹا۔ اس نے پھیلی کا چھالہ بن کر زندگی گزاری ہے لیکن چھالے کی جلن کیا ہوتی ہے وہ نہیں جانتی۔ اس کی ساس اللہ بخشے ذرا مزاج دار خاتون تھیں۔ سخت مزاج بھی تھیں لیکن ویسی نہیں جیسی کہ زمین بتایا کرتی تھی۔ ساس بہر حال ساس ہی ہوتی ہے۔ ایسی ایسی جلاؤ فطرت ساسیں ہوتی ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ اچھے مزاج کی ساس کی بھی چند ایک باتیں چبھتی ہیں۔ لیکن زمین ذرا جلدی بھڑک جاتی تھی، باقی سب تو ٹھیک ہیں۔ شوہر بھی شریف بندہ ہے، اس لیے زیر عتاب آیا رہتا ہے۔ خیر اب تو وہ گزر گئیں۔ سارا گھر زمین کے کاندھوں پہ

ہے۔ سب نے خوشی خوشی اس کی حکمرانی قبول کی ہے۔ تمہاری بات اور ہے، تم میں صبر و برداشت زیادہ ہے۔ اب تو تمہاری کوئی ساس نہ ہوگی لیکن اگر وہ زندہ ہوئیں تب بھی تمہاری مزے سے بھج جاتی۔

وہ یہ سن کر چپ کر گئی۔ اس کی چپ کو رضامندی جانتے ہوئے آنٹی نے ان لوگوں کو مثبت جواب دے دیا، شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ خاندان میں خبر پھیلی کہ شادی کے دو سرے سال گھر سے طلاق کا میل لگا کر نکالی جانے والی خوش بخت کی وہ بیٹی جسے اس نے سلائی کر کر کے بالا ہے اور جسے ماں کے بعد ماموؤں نے رکھنا تک رکھنا گوارا نہ کیا۔ اس کی شادی فیکٹریوں کے مالک حاجی سلطان احمد کے چھوٹے بیٹے، چارڑا اکاؤنٹنٹ، خوبرو، وجیرہ، نصیب احمد سے ہو رہی ہے۔ سب کے دلوں پہ جیسے سانپ لوٹ گئے۔ جلے دل کی بھاپ منہ کے رستے نکلنے لگی۔

”ارے ہٹو کہاں کی شادی، کسی شادی، نرمین تو سدا کی مطلبی اور چالاک ہے۔ اپنی چاکری کرانے کے لیے ملازمہ نکاح میں لے جا رہی ہے۔“

”اور کیا۔ سنا ہے لڑکا اسلام آباد میں رہتا ہے اپنا فلیٹ ہے گاڑی ہے اتنی اچھی نوکری اور حسین بھی بہت ہے اس کے لیے یہ یتیم مسکین مری چھپکلی ہی رہ گئی تھی۔“

”ہاں وہ تو بھابھی کے سپرد کر کے خود اسلام آباد چلا جائے گا۔ ارے دیو بھوت سے لڑکوں کو ذرا اچھی نوکریاں مل جائیں تو حور پریاں مانگتے ہیں، بمعہ جنت کے یعنی رعب و ابوالی سسرال ہو اور بھاری جینز بھی“

نجانے نرمین نے کیا جادو چلایا ہو گا۔؟

”تم نے اس کے سر کو تو دیکھ رکھا ہو گا۔ اپنے حاجی صاحب کو۔ انہی کے ذریعے معاملہ طے کیا ہو گا۔ بڑے خدا ترس انسان ہیں۔ نرمین نے نقشہ کھینچا ہو گا خوش نما کی بیچاری کا وہ جنت کے لالچ میں بیٹا داؤ پہ لگانے کو تیار ہو گئے۔ جوان لڑکا وہ بھی کماؤ، خود مختار، پتا نہیں کس طرح دھمکیاں دے دے کر مجبور کیا ہو گا۔“

یہ سب چہ میگوئیاں اسے سرا سیمہ کرنے لگیں۔

نرمین باجی سے وہ بخوبی واقف تھی قدرے لاپرواہ کام چور اور ناشکری سی ضرور تھیں لیکن آخر کو تاجور آنٹی کی بیٹی تھیں، خود غرض اور منصوبہ ساز ہرگز نہیں تھیں اس لیے اس بات پہ تو اسے یقین نہ آیا کہ وہ اسے بے دام کی ملازمہ بنانے کی خاطر دیواری کے روپ میں لیے جا رہی ہیں البتہ خدا ترسی، بیچاریگی اور ثواب کمانے والی بات کہیں دماغ کے اندر اٹک کے رہ گئی۔

”باجی پلیز! میرے ساتھ یہ ظلم مت کریں، آپ اور آنٹی میرے اپنے ہیں۔ آپ کے سوا احسان میں جی جان سے اپنے سر لے سکتی ہوں لیکن غیروں کے آگے مجھے ہلکامت کریں۔ مجھ سے ساری عمر کسی کے آگے احسان مندی سے سر جھکا کے نہیں جیا جائے گا، اس احساس کے ساتھ کہ مجھے میری اوقات سے بڑھ کے نوازا گیا۔ میں نہیں چاہتی، مجھ پہ ترس کھا کر بحالتِ مجبوری کوئی مجھے اپنا لے۔“

”پگلی! تم کن چکروں میں پڑ گئی ہو، کون کھا رہا ہے تم پہ ترس، ارے ہم سب پورے ارمانوں کے ساتھ تمہیں اپنا بنا رہے ہیں۔“

”مجھے بنائیے مت باجی! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آج کل لوگوں نے اپنی بہوؤں کے لیے کیا معیار بنا رکھے ہیں۔ میں کم از کم آپ کی سسرال کے معیار کے مطابق تو نہیں ہوں، نہ باپ نہ بھائی، نہ جائیداد نہ جینز۔“

”انہیں صرف تمہاری ضرورت ہے۔“

”ہاں، ایسی ہی حور پری ہوں ناں میں۔“ وہ چڑ کے اٹھ گئی، کسی سے اپنی بات منوانے کی پوزیشن میں ہی نہ تھی۔ آنٹی نے اس دن خدشہ بھی تو ایسا ظاہر کیا تھا، ناچار آنسو بہاتی مایوں بھی بیٹھ گئی۔

نرمین باجی کی سسرال (اور اب اس کی بھی) جہلم میں تھی۔ بارات لے کر انہیں لاہور تو آنا ہی تھا۔ باجی کے مشورے پہ مندی کی تقریب مشترکہ کر لی گئی تاکہ آنے جانے کے وقت کی بچت ہو، سب لوگ مندی والے دن ہی لاہور پہنچ گئے۔ لاہور میں ان کے قریبی

عزیز تھے جہاں قیام کیا۔ شام کو جب لڑکے والے
مندی لے کر آئے تو لڑکائیں خود ہمراہ تھیں۔
طے پایا کہ ابھی اسی وقت لڑکی والے بھی رسم ادا
کر لیں۔ اور لڑکی والے تھے کون، تاجور آنٹی اور ان کی
فیملی بلکہ تاجور آنٹی ہی کیونکہ ان کے بیٹوں کو اس
شادی پہ تو کوئی خاص اعتراض نہ تھا مگر ماں کا ایک پرانی
لڑکی کے لیے اتنا روپیہ پانی کی طرح بہانا پسند نہ آیا
حالانکہ خوش نمائے ہر ممکن طریقے سے آنٹی پہ زیادہ
بار نہ ڈالنے کی کوشش کی۔

دوسری جانب سے بھی جینز کا خاص مطالبہ نہ تھا پھر
بھی آنٹی نے تقریب وغیرہ کا جو خرچہ کیا وہی کافی تھا۔
چند سوٹ اور سینڈلیس آنٹی اور باجی نے بنادیں۔
ماموں نے دنیا دکھاوے کو دس دس ہزار روپیہ اس کی
ہتھیلی پہ رکھا، وہ لینے میں متامل تھی مگر آنٹی کے
اشارے پہ رکھ لیا۔

یوں دس جوڑے کپڑوں، ٹوہائی تولے کے زیورات
اور بیس ہزار نقد کے ساتھ وہ رخصت ہونے کو تیار
تھی۔ اسے بڑے ماموں کی بیٹی شائلہ کی شادی کی تمام
تفصیلات یاد تھیں، کیا چیز تھی جو جینز میں نہ دی گئی
تھی۔ اور باجی زمین کی شادی پہ کیا کم روٹی تھی لیکن
اسی گھر سے جب اس کے لیے مندی آئی تو اسے اپنی
کم مائیگی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔

تاجور آنٹی جوان بیٹوں کے آگے مجبور و بے بس
تھیں، اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ہاتھ
بندھے ہی رہے جب کہ وہاں سے آنے والی مندی کی
جج دھج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ بری بھی اسی دن
دے دی گئی تاکہ شادی کے روز دلہن کو بری کے
زیورات اور لباس پہنایا جائے اس کی کزنز آکر اسے
شاندار ڈریسز اور بھاری جیولری کی تفصیلات سناتی
رہیں اور وہ الجھتی رہی۔

”تنی انویسٹمنٹ اور اس بیکار وجود پہ۔۔۔“ یہ بات
اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

کبھی کبھی اسے ان عورتوں کی باتوں پہ یقین سا آنے
لگتا کہ ضرور اس میں زمین باجی کا کوئی مفاد وابستہ

ہے۔ کبھی فلموں کہانیوں میں بڑھی چویشیز یاد آتیں کہ
کس طرح ایک ایب نارمل لڑکے یا منشیات کے
عادی کو دھوکے سے کسی غریب بے سہارا لڑکی کے لیے
باندھ دیا جاتا ہے اور کبھی وہ تاجور آنٹی کے خلوص کے
آگے ہار مانتے ہوئے ان تمام وسوسوں کو جھٹک دیتی
لیکن مطمئن پھر بھی نہ ہوتی۔

نازواں کے پیچھے پڑی تھی کہ ایک نظر کھڑکی سے
باہر اپنے ہونے والے دولہا کو دیکھ لے۔

”اٹھ ناں خوشی! اک منٹ دیکھ تو سہی، کیسے
بھنگڑے ڈال رہا ہے اپنی مندی پہ خود ہی۔“

اس کے بار بار کہنے پہ تنگ آکے وہ مرے مرے
قدموں سے کھڑکی تک گئی۔ باہر جھانکا، نازو کی نشاندہی
پہ لان کے وسط میں پیڑھے پہ عورتوں کے درمیان
اسے بیٹھا دیکھا۔ گیندے اور سورج مکھی کے پھولوں
سے سجا پڑھا لان میں پچھلی زرد اور سرخ دریاں، سبز
اور پیلے ملبوسات میں سچی سنوری عورتیں اور ان کے
درمیان راجہ اندر رتنا بیٹھا وہ نصیب تھا۔

دو تین روز کی بڑھی شیو، تیل لگے بکھرے بالوں
میں وہ اس قدر دمک رہا تھا کہ وہ خود حیران رہ گئی۔ جو
حالت عورتوں نے اس کی کردی تھی تیل، اینٹن اور
مٹھائی کے ساتھ، اس کے باوجود اس کے چہرے کی
بشاشت اور شگفتگی کمال تھی۔ سب سے بڑھ کر اس کی
شفاف موتی سی رنگت کی سنہری چمک۔۔۔ نجانے یہ
گرد و پیش میں چھائے پیلے رنگ کی جگمگاہٹ تھی یا
اس کی اپنی جلد میں سونا گندھا ہوا تھا۔

”منڈا تے رنج کے سوہنا اے۔“

تاجور آنٹی کی ضعیف ساس نے تبصرہ کیا۔

”سوہنا نہیں ناں! سوہنا ہے سوہنا۔“ کسی لڑکی نے
بڑی حسرت سے کہا۔ باہر لان میں کسی نے کیسٹ
لگا دیا۔

”منڈا سونے رنگ دا دل لے گیا میرا سوں رب
دی۔۔۔“

شبنم مجید کی آواز ماحول پہ چھا گئی اور دولہا کے
دوست پیلے دوپٹے لہرا لہرا کر ناچنے لگے۔ وہ ایک دم پیچھے

ہٹ گئی۔
اپنی جگہ تک جاتے جاتے اس نے راستے میں لگے
آئینے کی طرف دیکھنے سے دانستہ گریز کیا۔ باجی کے
اصرار پہ وہ یہ گہرے پیلے رنگ کا کرتا جامہ پہن تو چکی
تھی جس پہ سبز اور سلور گونا گونا گاتھا۔ لیکن جانتی تھی اس
گہرے رنگ کے لباس میں اس کا گندمی رنگ مدھم ہو
کر سانولا پڑ گیا ہو گا۔ ماتھے پہ ہتے تیل نے سارا چہرہ
چھپچھا کر رکھا تھا۔ نازو کے لگائے اٹھن نے پورے
وجود میں زردی گھول رکھی تھی اسے تو صبح آئینہ میں
خود کو دیکھ کر گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ بی بی کی مریضہ
لگ رہی تھی۔

”کچھ نہیں ہوتا“ اٹھن ایسے ہی اثر کرتا ہے جب
نہاؤ گی تو پھر دیکھنا میرے جادو اثر اٹھن کا مکمل۔“ اس
نے تسلی دی۔

”تو نے لڑکا دیکھا رتنا“ یہ خوشی تو اس کے آگے کچھ
بھی نہیں۔ شام لکھ کی سرگوشی نے اس کو احساس کمتری
کی آخری حد تک پہنچا دیا۔ جب زمین باجی اسے رسم
کے لیے لینے آئیں تو اس نے صاف انکار کر دیا۔
”پلیز باجی! میرا تماشا مت بنو اُمیں۔ آپ چاہتی
ہیں سب لوگ کھلم کھلا میرا مذاق اڑائیں۔ آپ نے
اپنے دیور کو خدا ترسی اور ہمدردی کے نام پہ راضی تو
کر لیا ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو“ آپ کی ساری بھاگ
دوڑ بیکار ہی جائے مجھے اس مرجھائی ہوئی حالت میں
دیکھ کر اس نے عین رسم کے موقع پر ہی انکار کر دیا تو
پھر۔۔۔“

”تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا خوشی؟ کیسی
انا پ شاپ باتیں کر رہی ہو۔ کس نے بھری ہے یہ
خرافات تمہارے دماغ میں اسٹوڈنٹ لڑکی! اتنا پڑھ لکھ
کے گنویا ہے بس تم نے تم میں کیا کمی ہے بتاؤ تو؟
ارے تعلیم اور ذہانت کے بل بوتے پہ معذور اور
نا مکمل انسان بھی دنیا کا سامنا پوری جرات کے ساتھ
کر لیتے ہیں اور تم۔۔۔؟ یہ موقع تمہیں اس قسم کی بحث کا
ورنہ میں تمہاری خوب خبر لیتی چلو اٹھو وہ دیکھو میرے
سسرال کی خواتین بھی اندر آرہی ہیں۔ شاباش بی

”جہاں سے لاؤں کانفیڈنس“ وہ تو میرے باپ نے
اس وقت میری روح سے کھینچ لیا تھا جب شاید میں
اس دنیا میں بھی نہیں آئی تھی۔ آپ تعلیم، ذہانت کی
بات کرتی ہیں، جرات اور حوصلے کی بتائیے میری ماں
میں کیا کمی تھی، سکھڑ، صابر، شاکر، محنتی، خوش اخلاق
اعلیٰ خاندان سے تعلق، لیکن اس کے بل بوتے پہ تو وہ
ایک دن بھی نہ قبولی گئیں۔“

زمین باجی کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر لڑکیوں کو قریب
آتے دیکھ کر آہستہ آواز میں بس اتنا کہہ سکیں۔

”عجیب ضدی لڑکی ہو“ اچھا کل کیا کرو گی“ اسی طرح
منہ چھپائے بیٹھی رہو گی۔“

”کل کا کل دیکھیں گے۔ آج تو بالکل ہمت نہیں
اس صلمے میں باہر جانے کی۔ کل نازو کسی بیوٹی پارلر
میں لے جا تو رہی ہے۔“ وہ طنزیہ ہنس کر دلا سا دینے
لگی۔ ”شاید وہ گزارے لائق بنا ہی دیں۔“

پھر زمین باجی نے ”دلہن کی شرم و جھجک“ کا بہانہ
بناتے ہوئے بات بمشکل سنبھالی اور یوں چند معتبر
خواتین نے کمرے کے اندر ہی رسم ادا کر لی۔

اگلے دن بیوٹی پارلر میں لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے
ہونے والی بد مزگی نے اور کام خراب کیا۔ اچھے خاصے
قیمتی شرارے اور بھاری زیورات کی بھی شوماری گئی
(اس کے ذاتی خیال میں ورنہ آنکھوں کا میک اپ
قدرے ڈارک ہو جانے اور ہیرا شاکل ڈھنگ کا نہ
بننے کے علاوہ کوئی خاص بات نہ ہوئی تھی) سسرال
پہنچنے کے بعد رہا باب نے اس کا از سر نو میک اپ کیا اور
کافی عورتوں کے تعریفی کلمات نے اس کی پسینہ جی
ہتھیلیوں، ڈوبتے دل اور کیکپاتے قدموں کو سہارا دیا۔
لیکن نصیب اس کی توقع سے کہیں برہہ کے مغرور
اور خود پسند واقع ہوا تھا اس نے اسے ذرا لفٹ نہ کرائی
نہ صرف یہ بلکہ شادی کے اگلے دن بھی سب کے
سامنے کھلم کھلا اسے مذاق کا نشانہ بنایا۔

وہ اس کی زبان سے ڈرنے لگی تھی، کبھی بھی کہیں
بھی کسی کے بھی سامنے کچھ بھی کہہ سکتا تھا اس حد

تک زبان دراز تھا۔

سسرال میں باقی سب کچھ فی الحال تو معمول کے مطابق ہی تھا۔ ساس دو سال پہلے گزر چکی تھیں اگرچہ خوش نما نے انہیں سرسری سادہ رکھا تھا لیکن نرمین باجی کے حوالے سے ان کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ ان کی اپنی ساس سے ذرا نہیں بنتی تھی شوہر سے بھی اسی سلسلے میں اختلافات رہتے۔

سر البتہ بے حد شریف النفس، نمازی، پرہیزگار انسان تھے۔ ان کی شخصیت کا نور چہرے سے ہی چھلکتا تھا۔ خوش نما کو یقین تھا وہ ضرور اس گھر میں ان کی حمایت سے آئی ہے ورنہ نرمین باجی اتنی بااثر بھی نہیں کہ دیورپہ زبردستی کر سکیں۔

”انہوں نے نیکی کمانے کے لیے میرا انتخاب کیا لیکن یہ کیا جانیں کہ انہیں تو ثواب مل جائے گا مجھے کیا ملے گا؟ ہر دم پیروں کے تلے زمین کھسکنے کا خوف، سر کی چھت اڑنے کا اندیشہ۔ بیٹے کو بچانے کی دھمکیاں، ڈراوے، جذباتی بلیک میلنگ کے ذریعے رضامند کر کے وہ تو مطمئن ہیں لیکن ساری بے اطمینانی تو میرے حصے میں آئی۔“

وہ دل گرفتہ ہو کر سوچتی۔ شادی کے پہلے ہفتے ہی اس نے اس رشتے کے انجام کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

”میرا ثواب کوئی ٹھکانا بھی نہیں۔ خدا نخواستہ کل کو اباجی نہ رہے تو نصیب پر کس کا زور؟ وہ اپنی من پسند لڑکی سے شادی کر لیں گے۔ میں کہاں جاؤں گی۔ اس سے تو اچھا تھا نرمین باجی میری شادی کسی کم رو، آن پڑھ اور غریب سے بندے سے کروادیتیں۔ کم از کم وہ میری قدر تو کرتا۔ اس کے ساتھ کھڑے ہونے میں مجھے یہ خدشہ تو نہ تھا کہ میری شخصیت گنہگار ہی ہے۔ افسوس! آئی! آپ نے غلط کہا تھا۔ میں پہلے بھی غیر محفوظ تھی اب بھی وہی بے سکونی ہے۔ مجھے تحفظ ہی تو چاہیے تھا، اسی کی تلاش میں آپ کے آسرے سے نکل کر شادی پہ تیار ہوئی تھی مگر کہاں ہے تحفظ، کہاں ہے عزت، ہر وقت یہی ڈر کہ کب وہ میرے باپ کی

طرح مجھے اپنے گھر سے۔“

وہ گھبرا کر اباجی کی لمبی عمر کی دعائیں مانگنے لگتی۔ جن کے دم سے اتنی سسلی تو تھی کہ نصیب کسی نہ کسی طرح اسے برداشت کرتے رہیں گے۔

رشتے کے بہنوئی کی حیثیت سے حبیب بھائی کو پہلے سے جانتی تھی، البتہ ان کی سنجیدہ طبیعت کی وجہ سے زیادہ بے تکلفی نہ تھی۔ اب جیٹھ کے قریبی رشتے میں بھی وہ اتنے ہی سرد مہر اور اجنبی اجنبی سے لگتے۔ اسے ان کا یہ گریز زیادہ اس لیے نہ جھجھکا کہ صرف اسی کے ساتھ نہیں بلکہ گھر کے تمام افراد کے ساتھ وہ لیے دیئے ہی رہتے۔

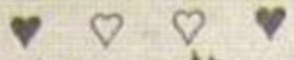
نرمین باجی بھی ان کی خشک مزاجی سے نالاں تھیں بلکہ وہ تو سراسر اسے بے حسی کا نام دیتیں۔ خود ان کا اپنا حال تو یہ تھا کہ بلا کی شدت پسند تھیں۔ مزاجوں کا یہی تضاد تھا جو وجہ تنازعہ بنا ہوا تھا لیکن اس معاملے میں جہاں باجی کی جذباتیت اور جلد بازی نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی وہاں حبیب بھائی کی مستحکم مزاجی مددگار ثابت ہوتی تھی اور دونوں نبھائے چلے جا رہے تھے۔ نہ صرف بیوی بلکہ نصیب بھی بڑے بھائی سے خائف اور گلہ کن رہتا۔

انہیں لمبے لمبے لپکھر جھاڑنے کا عارضہ تھا، بسا اوقات وہ اسے چھوٹے بچوں کی طرح ٹریٹ کرتے۔ چڑ کر اس نے انہیں ”خطیب بھائی۔“ کا نام دے چھوڑا تھا۔

نام کے حوالے سے بخشتا تو خیر اس نے کسی کو بھی نہیں تھا۔ نرمین باجی کو ہمیشہ غمگین بھابھی کہہ کر پکارتا اور یہ تو خوش نما بھی جانتی تھی انہیں سب کچھ حاصل ہوتے ہوئے بھی دکھڑے رونے کا کس قدر ہوکا ہے۔ اس نے ان کی زبانی اپنی سسرال کے اتنے قصے سن رکھے تھے کہ سوچ کر لرز جاتی اب چند ہی دنوں میں گھر کا ماحول پرکھ لینے کے بعد وہ جان گئی کہ وہ صرف ”عادتاً“ ذرا سی بات کو بڑھا چڑھا کے بیان کرتی ہوں گی۔

نصیب کی والدہ کو گزرے دو ہی سال تو ہوئے تھے اگر انہوں نے گھر کو اس قدر اذیت ناک بنا رکھا ہو تا تو

گن کے اس کے واپس جانے کا انتظار کرنے لگی۔



وہ نانو کے پاس بیٹھی مٹر چھیلی ہوئی ان سے ”قصص الانبیاء“ کے اقتباسات سن رہی تھی۔ اباجی رائے ونڈ کسی مذہبی اجتماع میں شرکت کے لیے گئے تھے، حسیب بھائی حسب معمول فیکٹری، بچے اسکول تھے اور زمین باجی مکمل فرصت کا یہ طویل دورانیہ اپنے کمرے میں انجوائے کرتی تھیں۔ انجمن کے کام کی نگرانی نانو ہی کرتی تھیں اور اس کے سر پہ سوار ہو کر دوپہر کا کھانا بھی پکواتیں۔ اب دو تین روز سے یہ ذمہ داری خوش نما نے اٹھا رکھی تھی۔ اس کا بس چلتا تو خود ہی پکانا بھی شروع کر دیتی لیکن نانو کو تو اس کا کچن میں جانا ہی سرے سے پسند نہ تھا۔

”ہفتہ بھر تو ہوا ہے تمہیں بیاہ کر آئے۔ خبردار جو چولہے کے پاس بھی گئیں تو۔ بس اتنا بہت ہے کہ اس موٹی انجمن کی نگرانی کر سکتی ہو۔ بڑی دلہن بس رات کا ہی کھانا بناتی ہیں وہ بھی حسیب کے کہنے پر کیونکہ اسے ملازمہ کے ہاتھ کا پکا کھانا پسند نہیں۔ ورنہ وہ تو کچن میں جھانک کر بھی نہ دیکھیں۔ خیر سلی تو مجھے بھی نہیں ہوتی۔ اسی لیے مسلسل اس کے سر پہ کھڑی رہتی ہوں۔ میں نہ دیکھوں تو گندے سندے ہاتھوں سے ہی آٹا بھی گوندھ لے اور سبزی گوشت بھی بغیر دھوئے چڑھا ڈالے۔ کم بخت کے ہاتھ ہر وقت تو سر میں گھے رہتے ہیں جوؤں کے ساتھ آنکھ پھولی کھیلنے کو۔“

”لیکن نانو! مجھ سے یوں فارغ وقت بھی تو نہیں گزرتا۔“

”بس بس، چپ کر کے یہ مہینہ گزار لو۔ پھر تمہارا ہاتھ کھیر میں ڈلواتی ہوں۔“

”کیوں کھیر خراب کرنی ہے نانو! خود ہی کہتی ہیں، رزق کی عزت کرو خود ہی اسے کھیر میں ہاتھ مارنے کی ترغیب دے رہی ہیں۔ چچہ کا استعمال کیوں نہیں سکھاتیں۔“ حسب عادت نصیب نے گفتگو میں دخل دیتے ہوئے ادھر ادھر کی ہانکی۔

وہ جربز ہو کر رہ گئی۔ ”آخر یہ اسلام آباد چلے کیوں

کچھ اثرات تو اب بھی نظر آتے۔ اسے تو زمین باجی کے تمام تر شکوے شکایتیں بے جا ہی لگتیں۔

جگنو اور بلبل، ان کے پیارے پیارے بچے، نصیب ان کے درست نام لیتا تو اسے بڑی حیرت ہوتی ایک روز اس نے خود ہی بتایا۔

”غمگین بھابھی نے اپنی اولاد کے نام رکھنے میں کوئی کسر چھوڑی ہے جو میں بگاڑوں۔ پتا ہے انہوں نے شادی کے بعد علامہ اقبال کی ”نہنی پہ کسی شجر کی تنہا“ بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا، بہت پڑھی تھی یہی دو نام ذہن پہ سوار تھے۔ یہ تو شکر ہے انہوں نے ”ایک مکڑا اور ایک مکھی“ زیادہ نہیں پڑھی۔“

اور نانو، اس گھر کی سب سے متوازن ہستی۔ بارعب بھی، سنجیدہ بھی، دوستانہ مزاج بھی۔

خوش نما کو حیرت ہوتی کہ ان کی اپنے چھوٹے نواسے سے اتنی کیسے بنتی ہے۔ وہ تو اس قدر منہ پھٹ اور بڑبڑولے ہیں، نانو کی کیسے بھج جاتی ہے۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

اس کا اپنا دل تو نانو کے پاس بہت لگتا۔ انہیں مقابل کے دل میں جھانکنا آتا تھا۔ ہمیشہ مخاطب کے موڈ کے مطابق گفتگو کرتیں۔ اباجی نے بالکل درست فیصلہ کیا تھا انہیں یہاں لانے کا۔ زمین باجی فطرتاً لاکھ مخلص سہی، ذمہ دار ہرگز نہ تھیں۔

اور گھر کا سب سے اہم فرد (کم از کم اس کے لیے) تو نصیب تھا کیونکہ وہ اسی کے حوالے سے یہاں موجود تھی لیکن یہ حوالہ قابل فخر نہ تھا اس کے لیے۔ وہ اس کا سامنا کم سے کم کرنے میں ہی اپنی عافیت جانتی۔ اسی سے بچنے کی خاطر اس نے جلد ہی گھر کے کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا، باجی اور نانو کے لاکھ منع کرنے کے باوجود۔ ویسے بھی اس نے اس گھر میں جگہ بنائے رکھنے کا یہی طریقہ سوچا کہ زیادہ سے زیادہ ”مفید“ ثابت ہو کر دکھاؤں۔

رہا نصیب تو اس کا کیا تھا، چھٹی ختم ہوتے ہی اس نے واپس اسلام آباد جانا تھا۔ گھر کے بقایا افراد کے ساتھ کھانا ملنا اس کے لیے اتنا مشکل نہ تھا۔ وہ دن گن

نہیں جاتے۔ اس کی سوچ کی ہر تان یہیں آکر ٹوٹی۔ اس وقت بھی یہی ہوا وہ اچھی بھلی بیٹھی نانو سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی ملکہ سبا سے ملاقات کے احوال سن رہی تھی کہ اچانک وہ شور و غل مچاتا اس طرف چلا آیا۔

”کیسی ہیں میری پری چہرہ نانو۔“ وہ نانو سے لپٹ گیا۔

”تمیز سے برخوردار۔ کتنی بار کہا ہے کم از کم مجھے تو اٹنے سیدھے ناموں سے مت پکارا کرو۔“ انہوں نے گردن سے اس کا حلقہ پرے ہٹایا۔

”یہ تو آپ کا خطاب ہے۔ اچھا بتائیں آپ کا نام کیا ہے۔“ اس نے پھر سے بائیں گلے میں ڈال دیں۔

”میرا نام مت چانو نصیب۔“

”نسیم بانو۔“ وہ سن کر بھی نہیں سن رہا تھا۔ یہی اس کی عادت تھی بس اپنی ہی بات لے جاتا۔ ”یہی نام ہے ناں۔ اور نسیم بانو کا خطاب پری چہرہ ہی تھا۔ ہے کہ نہیں؟ بتائیے آپ کے زمانے کی تو بڑی مشہور ہیروئن رہی ہے۔“

”حد سے زیادہ بد تمیز ہوتے جا رہے ہو تم نصیب۔ اب بوڑھی نالی کو گانے بجانے والیوں سے ملانے لگے ہو۔“ وہ بگڑ گئیں۔

”استغفر اللہ۔ توبہ توبہ۔ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ لگتا ہے آپ کو فلموں وغیرہ سے دلچسپی نہیں رہی اس لیے نہیں جانتیں کہ پری چہرہ نسیم بانو گانے والی نہیں تھی وہ تو صرف۔“

”اب تم چپ کرو گے یا پھر میں تمہیں دو لگاؤں؟“

”ہیں؟ نانو۔ یہ آپ کہہ رہی ہیں؟“ وہ صدمے کی شدت سے بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔

”آپ تو ایسی نہ تھیں نانو۔ یہ کس کی خشک صحبت نے آپ کی محبت کے سوتے خشک کر دیے۔“

اچھا اچھا سمجھ گیا۔ ضرور پری چہرہ نسیم بانو نانا جان کی پسندیدہ ہیروئن رہی ہوگی اسی لیے آپ اتنا خار کھا رہی ہیں اس کے نام سے۔“

”تمہیں تو میں۔“ سامنے سے آنٹی نور جہاں کو

آتے دیکھ کر نانو نے اسے ڈپٹنے کا پروگرام سمیٹتے ہوئے چپ رہنے کا اشارہ کیا مگر وہ نصیب ہی کیا جو چپ کر جائے۔

”بڑے دنوں بعد ملکہ ترنم کی سواری آئی ہے اور آہا۔۔۔ بند ریار! تو بھی آیا ہے۔ مجھے فرصت مل گئی اپنی دکانداری سے۔“ خالہ زاد منظر اس کا لنگوٹیا کھلایا جاسکتا تھا۔

”مجھے تو فرصت ہی فرصت تھی۔ آیا اس لیے نہیں کہ تم فرصت سے نہیں ہو گے۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

خوش نما بھی رباب کو دیکھ کر خوش ہو گئی۔ نانو تو بیٹی کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ نصیب منظر کو لے کر وہیں بیٹھ گیا۔ اسے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھنے سے احتراز ہی کیا کرتی۔ اس کی فقرے بازی کی رنگ ارد گرد کسی کو دیکھ کر زیادہ ہی پھڑک جایا کرتی تھی۔ وہ رباب کو لے کر وہاں سے ہٹنا ہی چاہتی تھی کہ انجمن آگئی۔ وہ اسے کچن کے ضروری کاموں کی تفصیل بتانے رک گئی لیکن اس سے پہلے نصیب اس کی کلاس لینے بیٹھ گیا۔

”کیوں بھی من دو من؟ یہ وقت ہے تمہارے آنے کا؟“

”ہا ہائے پائی جان کیا بتاواں رات کتنی زور کا درد اٹھا میرے پیٹ میں حالانکہ میں نے سکھی روٹی چاء کے ساتھ کھائی تھی مگر کباب کھانے والوں کے پیٹ ٹھیک رہتے ہیں، ہم گریبوں کے ہی درد ہوتا ہے۔ آدھی رات تڑپ کے گزار دیں۔ سویرے آنکھ دیر سے کھلی۔“

”یہ کہانیاں کسی اور کو سنانا کیا میں نہیں جانتا کہ تم ہر پیر والے دن دیر سے کیوں آتی ہو۔ اتوار کی رات سارے گلی والے کرائے پہ وی سی آر منگا کر ساری ساری رات فلمیں دیکھتے ہو۔ سوکھی روٹی چائے کے ساتھ کھانا منظور ہے لیکن فلم دیکھنی نہیں چھوڑنی۔“

”جب آپ کو پتا ہے تو پچھتے کیوں ہو؟“ ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتی وہ کچن کی طرف مڑنے والی تھی کہ خوش نما

نے آواز دے کر روک لیا۔

”انجمن! مٹر کے دانے میں نے نکال دیے ہیں یہ لے جاؤ ان میں سے تھوڑے سے نکال کر اگلنے کے لیے رکھ دینا“ باقی دھو کر رکھ دو۔ فریج میں سے ایک پکٹ مرغی کا اور ایک قہیے کا نکال کر پکھلنے کے لیے سنگ میں رکھ دو۔ لہسن، پیاز وغیرہ جاکر رکھ دو۔ آدھی پیاز سالن کے لیے کاٹنا اور آدھی کبابوں کے لیے پارمیک پیس لینا۔ کھانا میں خود بناؤں گی۔ خالہ آئی ہیں تم تو نجانے کیا گھول کر سامنے رکھ دیتی ہو۔“

کل ہی نانوں نے اس سے فرنی بنوائی تھی اس کے بے حد اصرار پر لیکن اس تاکید کے ساتھ کہ اسے ابھی سے کچن میں گھسنے کی کوئی ضرورت نہیں، وہ ان کی تاکید فراموش کیے اس وقت صرف مہمانداری کی فکر میں ہلکان ہو رہی تھی۔

”نہیں بھابھی پلیز کھانے کا اہتمام مت کریں۔“

رباب نے روکا۔

”اور کیا، ہم لوگ تو آپ کو ڈنر پر انوائٹ کرنے آئے ہیں۔“ منظر نے بھی منع کیا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ منظر بھابی! یہ آپ کا اپنا گھر ہے، تکلف کی کیا بات اور آپ کا گھر بھی ہمارا اپنا ہی ہے، خاص طور پر انوائٹ کرنے کی کیا ضرورت۔“ وہ اخلاق سے گویا ہوئی۔ اس محبت کے مظاہرے نے دونوں کو مزید تکلف کا مظاہرہ کرنے سے روک دیا۔

”من دو من! یہ تو بتاتی جاؤ رات کون سی فلمیں کھڑکائیں۔“ نصیب نے پھر اسے باتوں میں الجھانا چاہا۔

”ممولے دا کھڑاک، اک گجر سو بد معاش اور چو رانی۔ ساری کی ساری شان کی فلمیں تھیں۔ ایک سے ایک زبردست۔“ وہ مزالے کر بولی۔ ”پائی جان! ویسے آپس کی بات ہے۔ تسی کیوں نہیں

فلموں میں کام کرتے۔ تسی کسی ہیرو سے کم ہو۔“

”یار! فلموں میں کام کر تو لوں مگر ہیروئن کہاں سے لاؤں۔ کوئی نیچے گی میرے ساتھ؟“ بڑے خچرے کے ساتھ پوچھا گیا۔ خوش نما نے چونک کر اس کی اکڑی

گردن پر سچے مغرور چہرے کو دیکھا۔

”لوئی صمیمہ (صائمہ) ہے، ریمہ ہے۔“ وہ گنوانے لگی کہ اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

”بس بس اب مجھ سے اپنی چہیتوں کی شان میں گستاخی مت کرو ابیٹھنا۔“

”تمہارے لیے انڈیا سے ہیروئن امپورٹ کروائیں۔“ منظر نے پوچھا۔

”توبہ کرو، مجھے تو انڈیا کی کوئی ہیروئن ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ عجیب چالا کو ماسیاں سی ہوتی ہیں پھاپھے کٹنیاں سی۔“

”خیر ایسی بات تو نہیں اور سب کا چھوڑو، ایشواریہ رائے کے حسن کے بارے میں تو دور رائے ہو ہی نہیں سکتیں، ہر طرح سے مکمل اور بے داغ حسن۔“ وہ خود سب سے بڑا فین تھا۔

”بے شک۔۔۔ لیکن اس کی خوبصورتی پلاسٹک میڈ لگتی ہے۔ کسی مومی مجسمے کی طرح، شوکیں میں جچی سنوری پتلیاں ہوتی ہیں ناں۔۔۔ اس میں خوبصورتی ہے مگر دلکشی نہیں۔ حسین تو لگتی ہے مگر پیاری نہیں۔“

”اس نے یہ بھی ربحیکٹ کر دی تو اندر جانے کا ارادہ موقوف کر کے خوش نما ہانے سے وہیں ٹک کر کارپٹ پر بکھرے اخبار سمیٹنے لگی تاکہ اس شہزادہ کلفام کے معیار حسن کی حدیں تو جانچ لی جائیں۔ منظر کو بھی اس ذکر میں دلچسپی محسوس ہوئی وہ یوں ایک کے بعد ایک نام گنوانے لگا جیسے نصیب کے کسی یہاں کرتے ہی وہ فوراً اسے سائن کر کے فلم بناؤا لے گا۔

”ایسا کرتے ہیں ہالی وڈ کھنگالتے ہیں۔ ہالی وڈ کی کوئن جولیا رابرٹس؟“

”وہ بڑے دانتوں اور اونٹنی کے ہونٹوں والی؟“

”تمسخر سے کہا گیا۔“

”پینلوپ؟“

”اس کے نقش ضرورت سے زیادہ تھکے ہیں تو کیلی سی ناک اور تیز دھار ٹھوڑی۔“

”ڈریویری مور؟“

”قدرے بہتر۔ لیکن ایک تو موٹی ہوتی جا رہی ہے
دن بدن۔ دوسرے اس کے چہرے پہ ایک مخصوص سا
ہونٹ پن ہے“ اجڈ سا تاثر جو ساری خوبصورتی غارت کر
دیتا ہے۔“

”وہ بتاؤ اندر؟“

”اس چورنی کا تو نام بھی مت لینا۔“ اس نے کانوں
کو ہاتھ لگائے۔

”اچھا تو پھر کول کنڈمن؟“

”نہیں، اس کی ناک تم سے ملتی جلتی ہے۔“

سنجیدگی سے کہا گیا۔

”مجھ سے؟“ منظر اپنی ناک ٹول کر رہ گیا۔

”ہاں۔۔۔ موٹی نون۔۔۔ (بندر جیسی ناک)

”واہیات شخص۔۔۔ ذلیل آدمی۔“ وہ بڑبڑا کے

گالیاں دیتا رہ گیا۔

”ایسا کریں نصیب بھائی۔۔۔“ رباب نے اس بے

تکی بحث میں حصہ لیتے ہوئے مشورہ دینا چاہا۔ ”پھر تو

آپ کے ساتھ بھابھی کو ہی ہیروئن لینا چاہیے۔ ان کی

ناک بھی ستواں ہے۔ ہونٹ بھی نہ پینلوپ کی طرح

پتلے پتلے نامعلوم سی حدود والے ہیں نہ جولیا کی طرح

پھولے پھولے ڈبلی پتلی بھی ہیں۔“

”یار بندر! ایک ہیروئن کا نام تو تو نے لیا ہی نہیں۔

ہیلی ہیری۔“

”میرا دماغ خراب ہے کیا؟ تو نے فوراً“ کہہ دینا تھا وہ

کالی۔ گنجی۔“

”بس میں اب بھی وہی کہتا ہوں۔“ مبہم سے انداز

میں اس نے خوش نما پر ایسا وار کیا کہ وہ سر سے پیر تک

سلگ اٹھی۔

”لو۔ اسی لیے تو میں نے اس کا نام نہیں لیا۔ تم

خود ہی کہہ رہے ہو۔“ منظر شاید اس کی بات کی گہرائی

تک نہیں پہنچا تھا یا پھر جان کر انجان بن گیا تھا اور

رباب تو سرے سے متوجہ ہی نہیں تھی۔ اس کا سارا

انہماک بیوی پہ لگے کلنگ پروگرام کی طرف منتقل

ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود خوش نما کو سخت ترین سبکی کا

احساس ہوا۔ غم کے ساتھ ساتھ غصے نے اس پہ ایسا

شدید حملہ کیا کہ وہ اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کر سکی۔
اچانک ایک احساس نے اسے اس سکتے سے باہر آنے
پہ مجبور کیا۔

”غصہ؟ غصہ اور مجھے۔۔۔ مجھے تو صرف درد ہوتا

تھا“ بے بسی اور کسمپرسی کا احساس ہوتا تھا، تکلیف

پہنچتی تھی۔۔۔ غصہ کبھی نہیں آتا تھا۔ پھر اب

کیسے؟“

آنٹی کے نہ نہ کرنے کے باوجود نانو نے انہیں

کھانے پہ روک لیا۔ انہیں خوش نما کی پھرتی اور

مہمان نوازی کی یہ ادا بھی بہت بھائی تھی۔ زمین باجی تو

کھانا لگنے سے بس چند منٹ پہلے ہی کمرے سے برآمد

ہوئیں۔

”ارے نئی دلہن کا ہاتھ کھیر میں ڈلوا بھی لیا؟ ابھی

سے۔ ابھی تو دس روز ہوئے بیاہ کر آئی ہے۔“ اس

حیرت پہ نانو نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا، جیسے

کہہ رہی ہوں۔“ میں نہ کہتی تھی۔“ اس نے فوراً

وضاحت پیش کی۔

”بس آنٹی! بڑی ضد کے بعد یہ بات منوائی نانو

سے۔ ان کا بس چلے تو سال بھر مجھے تنکا نہ توڑنے

دیں۔ دراصل مجھ سے فارغ بیٹھے وقت نہیں گزرتا۔

یہ الگ بات کہ کھیر پکوا لینے کے بعد آج اتفاقاً“ ہی میرا

داؤ لگ گیا۔ ورنہ نانو کی نظر بڑی تیز ہے۔ کچن میں گھسنے

ہی کہاں دیتی ہیں۔“

”تو یہ سب تم نے اس ایک گھنٹے میں تیار کیا ہے؟“

انہوں نے میز پر نظر دوڑائی۔ مٹر پلاؤ، کچے قیسے کے

کیباب، مرغی اور آلو کا سالن، وہی پھلکیاں، چٹنی،

رائے، سلا۔۔۔ ہر طرح سے مکمل تھا۔ ”ماشا اللہ بڑی

پھرتیلی ہو۔“

”آنٹی! آپ کھانا شروع کیجیے۔ باقی تعریفیں بعد

کے لیے اٹھا رکھیں۔ اس قدر لذت ہے خوشی کے ہاتھ

میں۔“ جو بھی تھا، زمین باجی کم از کم اس کے لیے فراخ

دل ہی تھیں۔ ست مزاج سی طبیعت میں حسد کا مادہ

ذرا نہ تھا۔

اور پھر کھانے کی سب ہی نے جی بھر کے تعریف

کی۔

”کباب بے حد خستہ ہیں۔“ منظر نے کہا۔

”اور پلاؤ کی مہک بھی جدا ہے۔ کیا کسی کے بنائے مرغ پلاؤ میں بھی ایسی لذت ہوگی۔“ آنٹی نے قصیدہ پڑھا۔

”اور مجھے تو ولاپتی مرغی کا سالن کبھی پسند نہیں آیا، عجیب بے لذت سا گوشت ہوتا ہے ربرو جیسا مگر تم نے تو اس میں بھی ذائقہ بھر دیا۔“ نانوں نے کہا۔

”مسلا د کی سجاوٹ تو بے حد مہارت سے کی ہے آپ نے بھابھی۔“ رباب بولی۔

خوش نما حیران تھی اس نے تو عام سا کھانا بنایا تھا جیسا ہمیشہ بناتی چلی آرہی تھی اگرچہ ماموں کے گھر ماں نے اسے کام کاج میں زیادہ نہیں الجھایا تاکہ ان کی طرح وہ بھی گھن چکر نہ بن کے رہ جائے پھر بھی آتا اسے سب کچھ تھا۔ جب اماں کی طبیعت ٹھیک نہ ہوتی وہ ان کے منع کرنے کے باوجود سارا کام اپنے سر لے لیتی۔ اتنے بڑے کنبے کے لیے تین وقت پکا کر بھی کبھی ایک لفظ تعریف کا نہ اس کے حصے آیا نہ ہی اماں کے۔ اور یہاں سب کو مسلسل تعریفیں کرنا دیکھ کر وہ پزل سی ہو گئی۔ ایسا نہ تھا کہ اس گھر میں بھی خوش ذائقہ کھانا بنا ہی نہ تھا۔

وہ اتنے دنوں سے دیکھ تو رہی تھی۔ دوپہر کو انجمن کھانا اس لیے پکاتی تھی کیونکہ ابا دوپہر کا کھانا شروع سے ہی نہیں کھاتے تھے، حبیب بھائی آفس ہوتے تھے اس لیے زیادہ تر دن نہ ہوتا۔ آج کل اگرچہ نصیب آیا ہوا تھا لیکن وہ چھٹیاں بھر پور طریقے سے انجوائے کرتے ہوئے صبح دیر تک سویا رہتا، بھاری ناشتے کے بعد وہ بھی لچ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ رات کو چونکہ تمام افراد اکٹھے ہوتے اس لیے زمین باجی خاصا اہتمام کرتیں۔ سب ہی کی پسند کو دیکھ کر رکھتے ہوئے مینو تیار ہوتا اور خوش نما مان گئی تھی کہ بے شک ان کے ہاتھ میں بھی بے حد لذت تھی اور یہ اعتراف تو باجی برملا کرتیں کہ ان کو کھانا پکانا ان کی ساس نے سکھایا ہے۔

”بات صرف اتنی ہے کہ ان لوگوں کو دل بڑھانا آتا ہے، تعریف کرنے کے معاملے میں سارے ہی فراخ دل ہیں۔۔۔ سوائے۔۔۔“ اس نے یہ نتیجہ نکالا اور دزدیدہ نگاہوں سے سامنے بیٹھے نصیب کو دیکھا اس نے چونکہ گھنٹہ بھر پہلے ناشتہ ڈٹ کے کیا تھا اس لیے اس وقت صرف دو کباب ڈال کے بیٹھا تھا۔

”واہ!“ اس کے منہ سے بھی تعریفی کلمات ادا ہوئے تو وہ چونک گئی۔

”زبردست۔۔۔ یار! کیا مزا ہے ایمان سے۔۔۔ کس نے بنایا ہے یہ؟“

”کیا۔۔۔؟ یہ کباب؟“ باجی نے پوچھا۔
”نہیں۔۔۔ یہ اچار۔۔۔“

”بازار کا ہے۔“ باجی کے بجائے اس نے نارمل سے لہجے میں کہا۔ خلاف معمول اب اسے اس کی دل شکنی زیادہ محسوس نہیں ہوئی شاید باقی سب نے اتنی حوصلہ افزائی کی تھی کہ اب مزید ایک لفظ بھی تو صیف کا سننے کی تشنگی نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اسے دیکھنا چاہا۔ چٹخارے لے لے کر چٹوری عورتوں کی طرح آم کی پھانک چوستا ہوا وہ سر ہلا رہا تھا۔ خوش نما کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ جانے سے پہلے رباب اسے مزید ہدایت دے گئی۔

”بھابھی! پرسوں آپ کو جو ڈریس پہن کے آنا ہے وہ میں نکال دیتی ہوں اور اس کے ساتھ کی میچنگ سینڈل اور جیولری کے بارے میں بھی بتا دیتی ہوں۔ بڑی بھابھی آپ کو پارلر لے جائیں گی۔ چپ چاپ اچھی بچیوں کی طرح تیار ہو جائیے گا۔“

”گھر ہی کی تو بات ہے، چلو تمہاری پسند کا ڈریس میں پہن لوں گی لیکن یہ پارلر سے تیار ہونا کیا بہت ضروری ہے؟“

”بھابھی! آپ نہیں جانتیں، پرسوں کا ڈنر بڑا اسپیشل ہو گا۔ میرے تایا زاد بھائی کی بھی آپ کے ساتھ ہی شادی ہوئی ہے، ان کو بھی انوائٹ کیا ہے۔ میرا سارا ددھیال ہو گا۔ سب ہی دونوں دہنوں میں مقابلہ کریں گے اور میں چاہتی ہوں، میری فیورٹ

بھابھی ہی پرسوں کی پارٹی کی جان ہو۔“

”نہیں۔ تم تو مجھے نروس کر رہی ہو رباب؟“ وہ سچ گھبرا گئی۔ ہمیشہ سے اس قسم کی مقابلہ بازی سے اس کی جان جاتی تھی بلکہ وہ تو سرے سے کسی ایسی جگہ جانا ہی پسند نہیں کرتی تھی جہاں کوئی اس کا ٹولس لے، تنقیدی نظروں سے دیکھے اور یہ رباب اسے لمپیشن کے لیے تیار کر رہی ہے۔

”عجیب بچکانہ سا خیال ہے۔ دیکھو ناں، اچھا نہیں لگتا یوں بڑھ چڑھ کے۔ میرا مطلب ہے۔۔۔“ وہ وضاحت نہ کر سکی۔ دراصل وہ رباب پہ ظاہر نہ کرنا چاہ رہی تھی کہ وہ اس کے کزن کی بیوی کے مقابل آنے سے خوفزدہ ہے۔ لیکن اس نے ایک نہ سنی اور باجی کو بھی یہی تاکید کر کے چلی گئی اور خوش نما جانتی تھی کہ اگر وہ گریز کرے بھی تو زمین باجی نے نہیں بخشا تھا۔

”نجانے کیسی ہو گی رباب کی دوسری بھابھی۔ سنا ہے کراچی سے آئی ہے۔ پھر تو ضرور ماڈرن سی ہو گی، باجی بتا رہی تھیں، رباب کے یہ کزن بیوی میں ہیں، ظاہر ہے کوئی ایسی ویسی بیوی تو پسند نہیں کی ہو گی، کسی اونچے گھرانے کی الزماؤ حسین نازک سی لڑکی ہو گی۔ آئی نور جہاں کو دونوں فیملیز کو اکٹھے انوائٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

لیکن یہ تو اس کی سوچ تھی، آنٹی نے اس کے مشورے سے تو یہ گید رنگ نہیں رکھی تھی۔



ناچار اسے وہی کرنا پڑا جو باجی نے کہا۔ نصیب صبح سے غائب تھا۔ جاتے جاتے اسے تاکید کر گیا تھا۔ ”کہا میرا گرے سوٹ ڈرائی کلیں سے لے کر آتا ہی ہو گا۔ سامنے ہی رکھ دینا، بلیک ڈریس شوز، میرون سلور لائننگ والی ٹائی بھی نکال دینا۔ تم لوگ اپنے ٹائم پہ جانا۔ مجھے اگر کچھ دیر بھی ہو گئی تو میں خود ہی تیار ہو کے آ جاؤں گا۔“

”آپ کو گرے، بلیک اور سلور کلر بہت پسند ہے؟“ بے ساختگی میں وہ سوال کر بیٹھی۔ جواباً اس

نے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی۔

”یہ رنگ مجھے اتنے پسند تو نہیں، البتہ میری مجبوری ضرور ہیں، سیاہ رنگ مجھ پہ اٹھتا زیادہ ہے۔“

”اللہ رے خوش فہمی۔“ اس نے جل کر سوچا پھر آئینے میں اس کی شبیہ دیکھ کر سوچا (کہتے تو ٹھیک ہی ہیں۔ لیکن آخر یہ اپنے منہ سے آپ اپنی تعریف اپنی آسانی سے کیسے کر لیتے ہیں۔)

رباب کا نکالا لائٹ بریل نیٹ کا اسٹائلش سوٹ دیکھ کر وہ گڑبڑا گئی۔ بالکل جدید اسٹائل کی مختصر سی چست قمیص تھی اور تنگ پانچھوٹوں والا ٹراؤزر، البتہ ساڑھے تین گز کے گھیردار دوپٹے نے مشرقیت کی تھوڑی بہت لاج رکھی تھی۔ بری کے بہت سے سوٹ اس نے اب تک کھول کر بھی نہ دیکھے تھے ویسے بھی ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے، بمشکل دو ہفتے۔ اس لیے اسے پتا نہ تھا کہ رباب کا منتخب کردہ سوٹ کھولنے کے بعد اس قسم کا نکلے گا۔

اس نے ہمیشہ سے ایک مخصوص طرز کا شلوار قمیص پہنا تھا۔ بدلتے فیشن اس پہ اثر انداز نہ ہوتے تھے نہ کبھی آئینیں کشیں، نہ قمیص کی لمبائی کم یا زیادہ ہوئی، نہ پائینچے کھلے یا تنگ کیے۔ ڈرتے جھبکتے اس نے یہ ڈریس پہن ہی لیا۔

”الف میری لمبی ٹانگیں کتنی بے ڈھنگی لگ رہی ہیں چھوٹی قمیص کے ساتھ۔ کتنی فضول سی لگ رہی ہوں گی بالکل زرافس۔“

بچپن میں ہی اچانک اس کا قد تاڑ سا لمبا ہوا شروع ہو گیا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ خود سے چار سال بڑی شانلہ سے اونچی لگنے لگی۔ قد بڑھنے سے دبلا پن بھی نمایاں ہو گیا۔ سینک سلائی منحنی بازو، چوہیا سی گردن اور بانس جیسی ٹانگیں۔ یہ خصوصیات اس کے کزن گنایا کرتے۔ اپنے لمبے قد سے اس حد تک خائف ہوئی کہ گھبرا کر جھک جھک کر چلنا شروع کر دیا۔ الٹا اور مذاق بنا۔

”دیکھو اس عالم چنی کو، اب تو کب بھی نکل آیا ہے۔“

”ب تو بالکل اونٹنی ہی لگ رہی ہے۔ کوہاں بھی بنا ہوا ہے۔“

بڑی مشکل سے اماں نے اس کے کندھے جھکا کر کمر نکال کر چلنے کی عادت چھڑائی۔ اس وقت خود کو اس لباس میں دیکھ کر اسے پھر سے ”اونٹنی“ اور ”مٹی“ کی آوازیں آنے لگیں۔

باہی نے اس کا میک اپ بھی ڈریس اور پارٹی کے حساب سے کروایا، بال تو قدرتی گھنگھریالے تھے، یونیشن کو سیٹ کرنے میں محنت نہ کرنی پڑی۔

آئی کی گھر جا کر اس کے قدم ایک بار پھر لڑکھڑا گئے۔ وہاں تو اچھے خاصے لوگ جمع تھے۔ بالکل شادی والا گھر ہی لگ رہا تھا۔

جب رباب نے اس کا تعارف اپنے کزن کی دلہن سے کرایا تو وہ حیران رہ گئی۔ اتفاق سے اس نے بھی وہی سوٹ پہن رکھا تھا صرف رنگ کا فرق تھا۔ باقی ڈیزائننگ وغیرہ تک وہی تھی لیکن اس کی حیرانی کی وجہ صرف یہ نہیں تھی بلکہ ان محترمہ سحرش کی شخصیت تھی۔

اچھے خاصے فریہ وجود اور ٹھنکنے سے قدم کے ساتھ انہوں نے یہ فننگ والا ڈریس پہن رکھا تھا۔ شکل و صورت بری نہیں تھی بلکہ آنکھیں تو بہت ہی خوبصورت تھیں، ابھرے ہوئے پونٹوں کے ساتھ گہری بھوری بڑی بڑی اور مسکراتی ہوئی مسکراہٹ تو آنکھوں کے ساتھ ساتھ لبوں پہ بھی کھلی ہوئی تھی، ایک قطار میں سجے موتیوں کے سے ہموار دانت بھی بھلے لگ رہے تھے، کمر سے نیچے آتے گھنے مسلی براؤن بالوں کی آبشار تو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

بس سحرش رنگ اور جسم کی وجہ سے مار کھا گئی تھی۔ خوش نما کی رنگت اس کے ساتھ کھڑے ہوئے نکھر نے لگی تھی۔ اس کا رنگ تو اچھا خاصا پکا سانولا تھا۔ ٹھوڑی سے لڑکا گوشت، تھل تھل کرتے بازو اور کمر سے نملیاں ہوتی اضافی چربی اس کی ساری خوبصورتی کو مات دے رہی تھی لیکن شاید اسے اس بات کا ذرا احساس نہ تھا۔ اس نے بڑی شان سے

گہرے جامنی رنگ کا یہ چست لباس پہن رکھا تھا، ہم رنگ شیڈ کی لپ اسٹک اور آئی شیڈ اس کے سانولے چہرے پہ عجیب سا لگ رہا تھا۔

گردن برائے نام تھی۔ اس پہ اس نے سونے کا ملتان بھاری سیٹ پھنسا رکھا تھا۔ اپنی ہیئت کدائی سے بے پروا وہ سارے میں ادھر ادھر بے تکلفی سے چٹکے چھوڑتی پھر رہی تھی۔ خاصی ہنسوز طبیعت تھی شاید اس کی۔ سب ہی اس کے اخلاق اور شگفتہ مزاجی سے متاثر نظر آ رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ خوش نما کی سلجھی ہوئی طبیعت اور باوقار شخصیت کا بھی چرچا ہو رہا تھا۔ رباب کے دوھیال کی کتنی ہی لڑکیوں نے کھلے دل سے اس کے فکر اور قد کی تعریف کی۔ وہ جھینپ کر رہ گئی۔

پارٹی کے دوران مسلسل وہ سحرش کو ہی دیکھتی رہی۔ اس کے بے پناہ اعتماد کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہی۔ اور یہ انکشاف تو اسے ششدر ہی کر گیا کہ یہ دونوں کی لومینج ہے۔

ڈنر کے بعد جب سحرش اور خوش نما کو گفتگو کرنے کا موقع ملا تو سحرش اپنی عادت کے مطابق جلد ہی بے تکلف ہو گئی۔

”فرید میرے بہنوئی کے دوست ہیں، ایک پارٹی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے تو خیر ہمیشہ سے ہی نیوی بہت پسند رہی ہے۔ فرید کو بھی میرا کافیڈنس اور میرا گفتگو کا انداز بہت پسند آیا۔ ہسٹری سے انہیں بھی دلچسپی تھی اور مجھے بھی۔ میری معلومات سے تو وہ ایک دم متاثر ہو گئے۔“

اس نے مزے سے بتایا اور وہ حیران سوچتی رہی۔ ”بھلا معلومات سے متاثر ہو کر شادی بھی کوئی کرتا ہے؟ کیا کسی کے بات کرنے کے انداز سے بھی محبت ہو سکتی ہے؟“

جو بھی تھا سحرش سے ملاقات اور اس پارٹی میں شرکت کرنا، دونوں ہی اس میں ایک مثبت تبدیلی لانے کا باعث بنے۔ سحرش سے اس نے یہ جاننا کہ کسی بھی انسان میں فحش کمیاں ہی نہیں ہوتیں، قدرت ہر کسی

کو کوئی نہ کوئی تحفہ تو دے ہی دیتی ہے، سحرش کا بدن بھاری تھا تو کیا ہوا دل تو بڑا نرم و ملائم سا تھا، قد چھوٹا تھا تو کیا ہوا ذہانت کا گراف اچھے اچھوں سے بلند تھا، ہونٹ گلابی نہیں تھے لیکن دانت موتیوں کے سے شفاف تھے، آواز سریلی نہیں تھی لیکن باتیں دل موہ لینے والی تھیں۔ رنگ سانولا تھا لیکن آنکھوں میں قدرت نے شہد گھول رکھا تھا۔

فنکشن میں موجود تقریباً سب ہی افراد کا اسے پسندیدگی سے دیکھنا خود اس کا اعتماد بڑھانے میں بھی مددگار ثابت ہوا۔ اپنا لمبا قد جس سے وہ سدا شرمندگی کا شکار ہی رہی، پہلی بار اچھا لگا جب سب نے ہی کہا۔
”خوش نما! یہ لباس تو بنا ہی تمہارے لیے ہے۔“

اپنی کم گوئی کے باعث وہ ہمیشہ جھینپی ہی رہتی، اس کا خیال تھا کہ اسے زیادہ اچھے طریقے سے بات کرنا نہیں آتی، اس لیے محفل میں زیادہ تر خاموش ہی رہا کرتی۔ آج اس کی اس ادا کو بھی قبول کر لیا گیا، بادقار اور سلجھی ہوئی شخصیت کا نام دے کر۔

♥ ♥ ♥ ♥
آج انجمن خوب جج و جج کے آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دو لٹو بھی تھے۔ خوش نما کو یاد آیا، کل اس کے سسرال والوں نے تاریخ رکھنے آنا تھا یقیناً ”شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی ہوگی۔ جب ہی اس کے دانت اندر نہیں جا رہے تھے۔“

”آپ کو بھی مبارکاں بھابھی جی، بس آپ کی دعا میں ہیں۔“ اس کے مبارک باد دینے پہ وہ بڑی بدتر سی بن کے سر جھکاتے ہوئے بولی۔ رباب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ کل سے یہاں رہنے آئی ہوئی تھی جب سے اس گھر میں خوش نما کا اضافہ ہوا تھا اس کا دل یہاں خوب لگتا۔

”ویسے انجمن! تمہارا منگیتر کتنا کیا ہے؟“ رباب نے پوچھا۔

”جی اپنا کاروبار ہے اس کا۔ آج کل شادیوں کا سیزن ہے ناں جی تو اس کا دھندا خوب زوروں پہ ہے۔“
”کیوں کیا وہ ڈھولک کرائے پہ چڑھتا ہے؟“

نصیب نے کمرے سے نکل کر گفتگو میں حصہ لیا۔
”ہائے ہائے کیوں جی۔۔۔ خیری صلا۔۔۔“ وہ بگڑ گئی۔
”تو پھر منڈیا بجے والوں کے گروپ میں ہو گا۔“
”نہ جی۔ میرا جیسا کوئی میراثی ہے۔ وہ تو جی شادیوں پہ کھانے پکاتا ہے۔“ انجمن نے فخر سے بتایا۔
”اچھا اچھا ناںی ہے۔“

”ابو یس ای؟ اتنا کاروبار ہے اتنے بندے ملازم ہیں وہ کوئی آپ دیگ پکاتا ہے؟ بس دیگوں کے پاس جی (چارپائی) ڈال کے مسالے نوکروں کو پیس پیس کر دیتا ہے۔“ اس نے اپنے منگیتر کا ”گریڈ“ واضح کیا۔

”یوں کہو ناں کہ ”ہیڈ باورچی“ ہے۔ اچھا چلو چھوڑو اس ذکر کو۔ ایک بات تو بتاؤ۔“ وہ صلح جو انداز میں دلچسپی سے پوچھنے لگا۔

”من دو من! آج تم نے اتنا لشکرتا لشکا تالاں جوڑا پس رکھا ہے، چہرے اور گردن پہ پاؤڈر بھی تھپا ہے، کلائیوں میں چوڑیاں بھی پھنسا رکھی ہیں، منیوں میں کاجل بھی بہہ رہا ہے، بالوں میں تیل کی شیشی بھی اندیل رکھی ہے، ناک میں لونگ، کان میں بندے بھی پس رکھے ہیں، کمر پہ شیشوں والا پراندہ بھی لہرا رہا ہے۔ پھر بھی۔۔۔ پھر بھی تم خوبصورت کیوں نہیں لگ رہیں۔“ اتنی لمبی چوڑی تمہید کے بعد سنجیدگی سے پوچھا گیا۔ سوال سن کر شرم سے چمکتی دوہری ہوئی انجمن بھڑک اٹھی۔

”آپ بھی ناں پائی جان۔۔۔ بڑی زیادتی کرتے ہو۔ اپنا رنگ کیا چٹا ہے، ہر ویلے دو سروں کو باتیں ہی سناتے رہتے ہو۔ رنگ کا کیا ہے، وہ تو رنگیلے کا بھی چٹا ہی ہے۔ آپ کے ذرا بال جھڑ جائیں، موٹے ہو جاؤ تو رنگیلے ہی لگو گے۔“

بڑی جرات کے ساتھ کہتی وہ کچن میں چلی گئی۔ رباب اور خوش نما اپنی ہنسی پہ کنٹرول نہ کر سکیں اور نصیب شرمندہ شرمندہ سا باہر دروازہ کھولنے چلا گیا۔ مسلسل تیل ہو رہی تھی۔

”خشک نما! نجانے کس نے آپ کو محترمہ لکھتے ہوئے یہ رجسٹری بھیجی ہے۔ پکڑیے۔“ اس کی گود میں

دیکھا، کہیں اس کی شرارت تو نہیں لیکن اس کے چہرے پہ چھائی معصومیت نے زیادہ شک نہ کرنے دیا۔ ”تو پھر کیا باجی۔۔۔؟“ اس سے آگے وہ کچھ سوچ ہی نہ سکی۔ باجی، نانو اور تو اور اباجی تک اس کی نظم کی تعریفیں کرنے اور اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔

”اب ہمارے گھر میں ایک اہل قلم کا اضافہ ہو گیا ہے“ نانو نے کہا۔

”ہاں بھئی، یہ تو واقعی فخر کی بات ہے کہ ہماری بہو کا شمار اب ادیبوں، شاعروں میں ہو گا۔ آخر اتنے معیاری ماہنامے میں بڑے بڑے نامی گرامی شعرا کے کلام کے ساتھ اس کی نظم شائع ہوئی ہے۔“ اباجی کا جوش بھی قابل دید تھا۔ اس نے نصیب کا رد عمل جانچنے کے لیے چپکے سے اس طرف دیکھا وہ اسنو کر ٹور ٹامنٹ میں پوری طرح مگن تھا۔

”ہونہ، جل گئے۔۔۔ خود پسند اور احساس برتری کے شکار افراد کسی کی تعریف برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ انہیں کہاں اچھا لگ رہا ہو گا کہ میری کسی صلاحیت کی یوں قدر ہو۔“ اس نے خود میں احساس برتری پیدا کرنے کی ناکام سی کوشش کی لیکن غرور و فخر سے سدا کے الرجک دل نے آئینہ دکھا دیا۔

”اتنا اترانے کی ضرورت نہیں۔ اسے یہ پتا چل گیا کہ یہ نظم تم نے کس کے لیے لکھی ہے تو پھر۔۔۔؟“ وہ جھنجھلا کر رہ گئی۔

”مجھ سے اچھی تو انجمن ہے، کم از کم منہ پہ بات تو جرات سے کر جاتی ہے، میں تو دل ہی دل میں بھی کچھ کہنا چاہوں تو بات نہیں بنتی۔“

”بھابھی! آپ صرف شاعری کرتی ہیں یا افسانے بھی لکھتی ہیں؟“

دوپہر کو وہ کپڑے استری کر رہی تھی جب رباب نے پوچھا۔ اب وہ اسے کیسے سمجھائی کہ وہ تو یہ تک نہیں جانتی تھی کہ تنہائی میں ڈائری میں کبھی کبھار وہ جو چند الفاظ ترتیب دے لیتی تھی اسے کسی انجان کی شرارت کے باعث تسلیم کر لیا جائے گا۔

”نہیں کبھی کوشش نہیں کی لکھنے کی ویسے افسانے

خاکي لفافہ پھینکتے ہوئے وہ صوفہ پہ نیم دراز ہو گیا۔ نانو بھی اسی وقت لاؤنج میں داخل ہو میں۔ خوش نما حیرت زدہ تھی اسے کون رجسٹری بھیج سکتا ہے۔ اس کا دھیان تاجور آنٹی کی طرف گیا لیکن وہ تو خط ہی بھیج سکتی تھیں جبکہ اس لفافے کا تو اچھا خاصا وزن تھا۔ تجسس سے بے قرار ہو کر اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے لفافہ کھول لیا ایک معیاری ماہنامے کا پرچہ پھسل کر گود میں آگرا۔

رباب، رسائل کی شیدائی تھی، اس سے پہلے اس نے اچک کر رسالہ کھول لیا، اندر مختصر سے خط میں اطلاع دی گئی تھی کہ محترمہ خوش نما صاحبہ کی نظم نہ صرف قابل اشاعت ہے بلکہ ایڈیٹر صاحب نے بے حد پسند کی تھی اور اس سے مزید قلمی تعاون جاری رکھنے پہ اصرار بھی کیا تھا۔ رباب جلدی جلدی صفحے پلٹنے لگی جبکہ وہ سوچ میں رہ گئی۔

”ٹھیک ہے، کبھی کبھار میں تک بندی کر لیتی ہوں لیکن کس کو خبر ہوئی جس نے یہ مذاق کیا۔ جسے وہ مذاق سمجھ رہی تھی، وہ سچ ثابت ہوا۔ رباب اس کی نظم یا آواز بلند سب کو پڑھ کے سن رہی تھی۔ وہ مجھے

اپنے دل میں بسالے تو میں اس کی دھڑکن دھڑکن پہ اپنے لب رکھ دوں وہ مجھے

آنکھوں میں چھپالے تو میں اس کی پلک پلک پہ ستارے بھروں لیکن وہ تو مجھے اپنی منہمی میں رکھتا ہے جہاں میں

سانس بھی اس سے مانگ کے لیتی ہوں خوش نما کا سر جھک گیا۔ دل کے کسی گہرے کونے میں چھپے ان جذبات کا سر عام اشتہار لگوانا تو اس نے نہیں چاہا تھا۔ اس نے مشکوک نظروں سے رباب کو

”میں۔۔۔؟ میں باجی؟“ وہ گھبرا گئی۔ جگنو اور بلبل دونوں بیکن ہاؤس میں پڑھتے تھے اور وہ ہمیشہ سے اردو میڈیم میں رہی اسکول سے کالج تک۔

”لیکن باجی! وہ تو۔۔۔ ان کا کورس تو بہت مشکل ہے۔ اتنی موٹی موٹی کتابیں۔“

”او کم آن خوشی! کیسی باتیں کر رہی ہو۔ جگنو تھرڈ میں ہے اور بلبل نرسری میں، ایسا کیا افلاطونی کورس ہے ان کا۔ اور تم نے ایم اے کس لیے کر رکھا ہے۔“

”لیکن میں نے ایم اے اسلامیات میں کیا ہے جبکہ جگنو کے سب سبجیکٹس انگلش میں ہیں۔ میری انگلش بیکن ہاؤس کے لیول کی نہیں ہے۔ میں پڑھا نہیں پاؤں گی۔“ اس نے معذرت کرنا چاہی لیکن زمین باجی نے ایک نہ سنی۔

”تم اردو میڈیم میں پڑھی ہو مگر کالج تک انگلش سبجیکٹس پڑھ تو رکھا ہے ناں۔ ایسی بات بھی نہیں کہ پرائمری لیول تک کی انگلش نہ سمجھ سکو۔ نخرے مت کرو۔“ یہ طعنہ کاری ثابت ہوا۔ اپنے انکار کو خزا سمجھنا اسے پسند نہ آیا اور وہ فوراً ”پڑھانے پہ تیار ہو گئی۔“



”دیکھا، تم خوا مخواہ جب تک رہی تھیں۔ جگنو تو اتنا خوش ہے تم سے پڑھنے کے بعد کہ کہنے لگا یوٹر سے زیادہ اچھی طرح چچی بات سمجھاتی ہیں اس کا آج کا پیپر بھی بہت اچھا ہوا ہے۔“

”ہاں واقعی۔۔۔ دراصل کانونٹ اسکول کے نام کا رعب ہی اتنا ہوتا ہے کہ میں کتنا رہی تھی لیکن اب پتا چلا، میری انگلش اتنی بری بھی نہیں، پرائمری لیول تک تو میں اچھی طرح پڑھا سکتی ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو انگلش جگنو تھرڈ اسٹینڈرڈ میں پڑھ رہا ہے وہ میں نے انٹر میں پڑھی تھی۔ اب تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ آپ بے شک روزا نہیں بھیج دیا کیجئے۔“

روز پڑھانے کی آفر اس نے یہ سوچ کر کی کہ نصیب تو شاید ایک آدھ روز میں جانے والا تھا۔ اس کے جانے

پڑھنا پسند ہیں۔“

”مجھے بھی۔ لیکن میں بہت ناراض ہوتی ہیں میری اس عادت سے۔ کہتی ہیں لڑکیاں آئیڈیلسٹ ہو جاتی ہیں افسانے پڑھ کر۔ کیا واقعی؟“

”ہو سکتا ہے شاید نہیں۔“ وہ کیا جواب دیتی اس نے کبھی اس بات پہ غور ہی نہیں کیا تھا۔

”ویسے اگر آپ نے کوئی آئیڈیل بنا بھی رکھا ہو گا تو وہ نصیب بھائی کی صورت آپ کو مل ہی چکا ہے ہے ناں بھابھی۔“ خوش نما جانتی بھی برابر کے کمرے میں نصیب کمپیوٹر پہ کچھ کام کر رہا ہے۔ اس لیے اسے سنانے کو ذرا بلند آواز میں بولی۔

”کیسا آئیڈیل رباب! وہ جو افسانوی ہیروز کے تصور پہ چھایا ہوتا ہے وہ والا؟ مجھے تو آج تک ان کے آئیڈیل ہیروز کے خاکے ہی سمجھ میں نہیں آسکے۔ گھنے گھنگھریالے بھورے بال، چوڑی پیشانی، بھوری کالج سی آنکھیں، سرخ و سفید رنگت، گھنی مونچھوں کے تلے مسکراتے گلالی بھرے بھرے ہونٹ۔۔۔ ذرا ان سب کو تصویری خاکہ دے کر دیکھو۔ ایوب کھوسو کی تصویر بنتی ہے۔“

رباب کا ہنس ہنس کے برا حال ہو گیا۔ خود خوش نما اپنی جرات پہ حیران بھی نہ اس کی زبان لڑکھرائی نہ لفظ آگے پیچھے ہوئے۔ بڑی صفائی کے ساتھ وہ درودہ نصیب کے گورے رنگ اور خدو خال پہ وار کر گئی تھی۔ اس کامیابی نے اسے اور دلیر کیا۔

”اور ابھی تمہارے سامنے انجمن کہہ رہی تھی کہ گورا رنگ تو رنگیلا کا بھی ہے“ اسی سے اندازہ کر لو کہ مردوں کے اوپر یہ تشبیہات اور حسن کے استعارے کتنے بے ڈھب معلوم ہوتے ہیں۔“ (دوسرے کمرے میں موجود نصیب یقیناً ”تملارہے ہوں گے۔) اس نے مسرور ہو کر سوچا۔

”کیا بحث چل رہی ہے بھئی۔“ زمین باجی اندر آئیں۔ ”خوشی! تم سے ایک کام تھا۔ دو تین دن ذرا ٹائم نکال کر جگنو اور بلبل کو پڑھا دینا، ان کی یوٹر ایک ہفتے کی چھٹی پر ہے۔“

کے بعد وہ ذہنی طور پر زیادہ تروتازہ ہو کر بچوں کو پڑھا سکے گی۔ اس کی موجودگی ہر وقت خوش نما کے اعصاب پہ سوار رہتی۔

ویسے وہ نوٹ کر رہی تھی، دو تین دن سے وہ کم ہی اس کے مذاق اور طنز کی زد میں آرہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ اب خوش نمائے ہی اس کی پھبتیوں کو خاطر میں لانا کم کر دیا تھا۔ اب پہلے کی طرح اس کے کسی دل جلے ریمارکس پہ وہ گھنٹوں کڑھتی نہیں رہتی تھی نہ ہی خود ترسی کا شکار ہو کے کمرہ بند کر کے رویا کرتی۔ اس کی کوشش ہوتی کہ وہ اس کی باتوں کو خاطر میں لائے بغیر ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا کرے۔

اب گھر کے دوسرے افراد کے سامنے اسے اپنی سبکی کا احساس ہلکا نہیں کرتا تھا کیونکہ سب کے خلوص اور اعتماد نے اس کو اتنا بھاری بھر کم کر دیا تھا کہ فقط اس ایک شخص کی بے اعتنائی اور ناپسندیدگی اسے ڈانوا ڈول نہیں کرتی تھی۔ اس کی شخصیت میں یہ تبدیلی اس ایک مہینے کے اندر اندر ہوئی تھی۔ اب اس ایک مہینے میں اس نے شدت سے نصیب کی چھٹی ختم ہونے کا انتظار کیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اس گھر میں اور اس گھر کے مکیوں کے دل میں اس کے لیے خاصی جگہ ہے۔ وہ ساری عمر سکون کے ساتھ اس گھر کی چار دیواری میں گزار سکتی ہے، یہاں تحفظ بھی ہے، اعتماد بھی، محبت بھی اور خلوص بھی جبکہ نصیب۔۔۔

اس نے سن رکھا تھا کہ ”دلہن وہی جو پامان بھائے“ اور کبھی کبھی وہ شدت سے محسوس بھی کرتی تھی کہ ان چاہی سہاکن ہونے کا کرب کیا ہوتا ہے لیکن یہ احساس اسے خدا کے حضور سر بسجود ہونے پہ مجبور کر دیتا کہ شوہر کے نہ سہی، سسرال والوں کے دل میں تو جگہ بنالی ہے اس نے اور اگر کل کلاں کو نصیب اپنی گرہستی نئے سرے سے کسی پسندیدہ ہستی کے ساتھ بنانا چاہے تب بھی دربدری اس کا مقدر نہیں ہوگی۔

اس گھر کے اندر اس کے قدم مضبوطی سے جمے

تھے۔ اسے نصیب کے واپس اسلام آباد جانے کا انتظار تھا۔ پرسوں ہی نانوں نے ذکر کیا کہ نصیب کی ایک ماہ کی چھٹی ختم ہونے والی ہے تو اسے اپنے سر سے ایک بھاری بوجھ سرکتا محسوس ہوا لیکن وہ سٹپٹا کے رہ گئی جب یہ بوجھ سر سے گزر کر دل پہ آن ٹھہرا۔

”وہ واقعی چلے جائیں گے۔۔۔؟“

اس ادا اس سے سوال کے جواب میں اس کے پاس صرف سنائے تھے۔ وہ خوش ہونا چاہتی تھی۔ ہونہیں پاتی تھی۔

”لو اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوگی کہ انہیں تم پر ہا دیا کرو۔۔۔“ باجی کی آواز اسے خیالات سے کھینچ لائی۔ ”لیکن اب تمہیں بھی تو پرسوں اسلام آباد چلے جانا ہے۔ تمہاری وجہ سے میں تو بالکل ہی ناکارہ ہو کے رہ گئی ہوں۔ اتنے کم دنوں میں تم نے میری عادتیں ہی خراب کر ڈالیں۔ اب تمہارے جانے کے بعد مجھے پتا چلے گا۔ جب سارے گھر کی ذمہ داری ایک بار پھر میرے کندھوں پہ آجائے گی۔“

نرمین باجی نے تو اس کے ہوش ہی اڑا دیے۔ وہ اڑی اڑی رنگت کے ساتھ نصیب کو دیکھنے لگی کہ شاید وہ تردید کرے اور کچھ نہیں تو جھلا کر اتنا ہی کہہ دے۔

”میرا کیا دماغ خراب ہے جو اسے ساتھ لے کر جاؤں، اس سوغات کو آپ ہی سنبھالیے جو اتنے چاؤ سے بیاہ کر لائی ہیں۔“ وہ امتید بھری نظروں سے یہ دل شکن جملہ اس کے لبوں سے ادا ہونے کے انتظار میں اسے تکتے لگی جو آج اس کے لیے حیات بخش ثابت ہو سکتا تھا لیکن اس نے کہا تو یہ۔

”اسی لیے تو لے جا رہا ہوں۔ آپ نے میری بیوی کو باور چن اور دھو بنانا کے رکھ دیا۔ ایک تو بے چاری پہلے ہی اللہ کی طرف سے تول کر پاؤ بھر گوشت لائی تھی۔ آپ نے اور نانوں نے ایک مہینے کے اندر اندر بالکل ہی ڈھانچہ کر دی۔ اب دیکھنا میرے سارے دوست احباب کیا کیا تبصرہ کریں گے۔۔۔ دلہن کیا ہڑت سے کھود کر نکالی ہے۔؟ ذرا خود کو ایک نظر دیکھیں لیٹ لیٹ کر بے تحاشا اور اندھا دھند ”حسین“ ہو گئی

جو وہ چاہتا تھا کسی اور نے بھی اسے خوش نما کو ادھر چھوڑنے کے لیے نہیں کہا۔ دو دن تک اس کے آنسو نہیں تھے۔ سب سے ملتے وقت وہ یوں تڑپ تڑپ کے روئی جیسے اس کی رخصتی سات سمندر پار ہو رہی ہو۔

”خود کو سنبھالو خوشی! کیا ہو گیا ہے بیٹا۔ یہ تو اسلام آباد ہے۔ دو ڈھائی گھنٹے کا سفر۔ ہر مہینے آجایا کرتے۔ بلکہ ہر ہفتے۔“ نانوں نے تسلی دی۔

”ہاں نصیب! آئندہ تمہارا ہر ویک اینڈ یہیں گزرے گا۔ اینڈ ڈیش فائنل۔“ حسیب بھائی نے آرڈر دیا۔ اباجی نے ڈھیر ساری دعا میں دیں۔ رباب اور وہ ایک دوسرے کے گلے لگ کے دیر تک روٹی رہیں۔ باجی نجانے کیوں روتے میں بھی بار بار اسے دیکھ کر مسکرائے جارہی تھیں۔

”یہ تو الٹا کام ہو گیا۔ غمگین بھابھی آج دلشاد بیگم بنی ہوئی ہیں اور خشک نما نے دنیا سے خشکی مٹا ڈالنے کا عزم سر کر لیا ہے“ آنسو بہا بہا کر۔ ہاں بھئی من دو من! تمہارے اشاک میں اس وقت کوئی گانا ہے جو اس پجوشن پہ فٹ بیٹھتا ہو۔“

جواباً ”انجمن نے بھال بھال کر کے رونا شروع کر دیا۔“

”ہیں۔ ہیں۔ میں نے گانا گانے کو کہا تھا، تم تو قوالی کرنے بیٹھ گئیں۔“ نصیب کی سنہری رنگت تھمتھا رہی تھی، نجانے کس احساس سے۔ راستے بھر وہ گنگنا تا، سیٹی بجاتا رہا۔ وہ کمپنی کی طرف سے دی گئی گاڑی میں بالی روڈ اسلام آباد جا رہے تھے۔ ڈرائیور کے لحاظ سے شاید وہ اسے پھینٹنے سے گریز کر رہا تھا۔ لیکن کب تک۔۔۔؟ خوش نما نے سوچا۔

”گھر جاتے ہی یہ پھر سے وہی بن جائیں گے۔“ اس نے گردن موڑے بغیر کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔

سریٹ کی پشت سے لگائے وہ شاید سو گیا تھا۔ آج اس نے شیو بھی نہیں کی تھی، براؤن رواں روشنی کے عکس سے چہرے پہ پھیلے سونے کے زرے

ہیں۔“ ”چلو چلو۔“ زمین باجی کو اس کا اپنی صحت بہ تبصرہ پسند نہ آیا۔ ”مونی کب ہوئی ہوں میں۔ ہاں پہلے کی نسبت اب جسم ذرا بھر گیا ہے۔“ ”جی ہاں۔“ لبالب۔ ”اس کے فی البدیہہ جواب پہ تپ کر باجی واک آؤٹ کر گئیں۔ وہ اب تک بت بنی بیٹھی تھی۔ نصیب نے اٹھ کے اس کے چہرے کے سامنے چٹکی بجائی۔

”خشک نما۔“ ”جی۔“ ”مری مری سی آواز میں وہ بولی۔“ ”صرف کل کا دن ہے تیاری کے لیے، پیکنگ شروع کرو۔“

”کیا۔ میں۔ مم۔ میں۔ واقعی آپ کے ساتھ جا رہی ہوں؟“ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ جو شخص اسے ایک نظر دیکھنا گوارا نہ کرتا ہو وہ بغیر کسی دباؤ کے اسے اپنے ساتھ کیسے لے جا رہا ہے (یقیناً) یہ مذاق کر رہے ہوں گے۔

”تو اور کیا کروں۔ بیوی تم میری ہو، مجھے سزا ملنی چاہیے تمہیں بھگتنے کی۔ میرے گھر والوں کا کیا قصور کہ تمہیں ان کے سینے پہ مونگ دلنے چھوڑ جاؤں۔“ کڑوے انداز میں کتاوہ الماری سے کپڑے نکال نکال کر بیڈ پہ ڈھیر کرنے لگا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن کہہ نہ سکی پھر سے ہمت کمزور پڑنے لگی، الفاظ اندر ہی رستہ کھونے لگے اور زبان گنگ ہو گئی۔

”نصیب! آپ خود پسند ہی نہیں، اذیت پسند بھی ہیں۔“ اس کی چوڑی پشت کو شکایتی نظروں سے دیکھتی وہ دل کے پھپھو لے دل میں ہی پھوڑنے لگی۔

میں جانتی ہوں آپ کے معیار پہ پورا اترنے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ کہ آپ کا تو معیار بھی بڑا اونچا ہے۔ حسن کے نجانے کس کس شاہکار میں آپ سو سو نقص نکال دیتے ہیں جبکہ میں تو حسن کی کسی تشریح پہ پوری نہیں اترتی۔ مجھے یہیں رہنے دیجیے پلیز۔“ وہ بند لبوں سے التجا کرنے لگی۔

اس کی خاموش فریادیں خاموش ہی رہیں۔ ہوا وہی

کی طرح دمک رہا تھا۔ بلا کی معصومیت لیے وہ اسے ایک دم ہی اچھا لگا۔

”کیا تھا جو اس خوبصورت چہرے کے پیچھے ایک حساس سامجیت کرنے والا دل بھی ہوتا۔“

اس نے پہلی بار واضح طور پر اس کی وجاہت کو تسلیم کیا۔ دراصل اس کا رویہ اتنا دل شکن ہوتا کہ خوش نما کا دھیان کم ہی اس کی شخصیت کے اچھے پہلوؤں کی طرف جاتا تھا۔

”وہاں تو پھر سارے اپنے تھے۔ یہاں اجنبی شہر میں بیگانے لوگوں کے سامنے بھی اگر انہوں نے میرا مذاق اڑانا شروع کر دیا تو۔۔۔؟“ اسے نئی فکر لاحق ہوئی۔

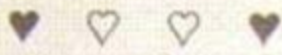
”اف تو یہ کیا مصیبت ہے۔ میں تو یوں مری جا رہی ہوں جیسے مجھے قتل گاہ لے جایا جا رہا ہو۔ کیا کریں گے یہ زیادہ سے زیادہ۔“ اس نے بہادر مہنتے ہوئے سوچا۔

”ہر شخص کا ایک معیار ہوتا ہے اگر میں ان کے معیار کے مطابق نہیں تو مجھے حقیقت پسندی سے یہ تسلیم کر لینا چاہیے۔“ بڑی میچورنی کے ساتھ اس نے خود کو سمجھا لیا۔

”نانو میری کم گوئی، احساس ذمہ داری اور سکھڑاپے کی وجہ سے مجھے پسند کرتی ہیں۔ اباجی کو میرا نماز پنجگانہ باقاعدگی سے ادا کرنا پسند آیا تھا۔ زمین باجی کو یہ بات اچھی لگتی تھی کہ میں کام سے گھبراہٹ نہیں ہوں۔ ریاب کی مجھ سے دوستی کی وجہ ایک جیسی دلچسپیاں تھیں۔ اب اگر نصیب کو مجھ میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تو ظاہر ہے کہ جو انہیں چاہیے وہ مجھ میں نہیں۔ ان کا معیار شاید صرف اور صرف حسن ہے جو مجھ میں نہیں۔ کم از کم ان کے تصور کے مطابق تو نہیں۔ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے سوا اب کوئی چارہ نہیں۔ اس میں نہ میرا قصور ہے نہ ہی ان کا۔ ہاں ایک بیوی ہونے کے ناتے میں یہ آخری کوشش ضرور کروں گی کہ یا تو ان کے معیار کے قریب تر پہنچ جاؤں یا پھر ان کا معیار بھی بدل ڈالوں۔ کیا مجھے یہ آخری کوشش نہیں کرنی چاہیے؟ کیا مجھے اپنی بقا کی جنگ لڑنے کے لیے تھوڑا بہت بھی ہاتھ پاؤں

نہیں مارنے چاہئیں؟ کیا میں اتنی ہی بے وصف ہوں؟ کیا میری سوچ بھی اتنی ہی سطحی ہے کہ عین نقش اور رنگت کے کامپلیکس سے اور ابھر ہی نہ سکے۔ آخر مجھ میں کچھ تو ہے جو کچھ لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔ سراہتے ہیں اور۔۔۔ ان کچھ لوگوں میں نصیب کیوں نہیں شامل ہو سکتے۔“

اس نے اسلام آباد پہنچتے پہنچتے اپنی سوچ کو ایک واضح عزم کی صورت دے دی تھی۔



”اسلام آباد شروع ہو گیا؟“ صاف شفاف چوڑی سڑکیں اور پارکس سرکاری عمارتیں دیکھ کر اس نے پوچھا۔

”اسلام آباد کیا کوئی ڈرامہ ہے جو شروع ہو گیا۔“

الٹا ہی جواب ملا۔

وہ صبح سات بجے کے قریب گھر سے نکلے تھے اور راستے میں صرف ایک جگہ آدھ گھنٹے کے لیے چائے پینے رکے تھے اب دن کے دس بجے ان کی گاڑی اسلام آباد کی سب سے مصروف شاہراہ سے گزر رہی تھی۔ ایک پُر رونق مارکیٹ کے درمیان اونچی سی براؤن بلڈنگ کے آگے گاڑی رکی۔ اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔

دن کے اس وقت اگرچہ مارکیٹ میں خاص چل پھل نہ تھی لیکن گرد و پیش کا جائزہ لینے سے پتا چلتا تھا کہ یہ ایک مصروف ترین شاپنگ سینٹر ہو گا۔ بوتھ کمپس، سپراسٹورز، ریسٹوران اور آفسز کے بورڈ لگے تھے۔ اسی بلڈنگ کے اوپری فلورز پہ رہائشی فلیٹس تھے جن میں سے ایک کالا گواہ کھول رہا تھا۔

”کیا آپ کا آفس یہاں سے قریب ہی ہے؟“ اس نے قیاس کیا۔

”نہیں، میرا آفس تو سیکٹر ایف کے قریب ہے۔“ اس علاقے کا سکون اور خوبصورتی قابل رشک سمجھے جاتے ہیں لیکن میرا دل وہاں نہیں لگا۔ میں شروع میں ایک کولنگ کے ساتھ وہیں پہنچ گیا تھا۔ ایک تو پہلے ہی قبیلے سے کٹ کر دوسرے شہر میں رہنا اور پھر وہ

مجھے میک اپ بالکل بھی نہیں آتا اور یہاں نہ رہا ہے نہ زمین باجی۔“

”اول۔ ڈرائیور تو۔ مجھے بہت ضروری کام ہے ورنہ میں ضرور۔“ وہ پیشانی مسلتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ ”چھادیکھتے ہیں کوئی حل۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”میں کام سے جا رہا ہوں، کچھ پتا نہیں کب آؤں، البتہ ایک خاتون آئیں گی رہانام کی۔ میرے دوست کی مسز ہیں۔ ان کے ساتھ چلی جانا جہاں بھی وہ لے جائیں۔ البتہ میری تمام تیاری کر کے جانا، میرے پاس اتنا نام نہیں ہو گا۔“ وہ ہدایات دیتا باہر نکل گیا۔

اس کے تمام انداز و اطوار اتنے نارمل تھے کہ خوش نما کو یقین نہ آسکا یہ وہی نصیب ہے جو سیدھی سادی بات بھی بغیر طنز کے سلی سوارے ٹانگے بغیر نہیں کرتا تھا اور خصوصاً اس کی ہریات کا الٹا مطلب نکال کر اسے شرمندہ کرنا تو جیسے اس کی عادت تھی۔

کافی کے ساتھ چند بسکٹ لے کر وہ کچھ دیر کے لیے سو گئی۔ حیرت انگیز طور پر وہ پرسکون تھی۔ وہاں سے نکلتے وقت اس کے دامن میں اندیشوں و وسوسوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ نا اُمیدی اور مایوسی کی گھٹا ٹوپ تاریکی تھی رستے بھر وہ خود سے الجھتی آئی تھی لیکن اب جیسے دل کو قرار سا مل گیا ہو۔ وہ خود اس کی وجہ جاننے سے قاصر تھی۔

پھر رہا آئیں۔ مسز وی۔ بڑی گرمجوشی اور اخلاق سے اس سے ملیں۔ باتوں اتنی کہ ایک بات کہنے کے بعد مخاطب کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اگلی بات شروع کر دیتیں۔

”اللہ کس قدر شوق تھا تم سے ملنے کا، نصیب نے تعریفیں کر کے اتنا اشتیاق برپا رکھا تھا کہ پوچھو ہی مت۔“

وہ چونکی شادی سے پہلے نصیب نے بھلا کب دیکھ رکھا تھا مجھے اور بعد میں وہ اسلام آباد گئے ہی نہیں تو تعریفوں کے جھوٹے پل کب باندھے۔ اس کے سوال کرنے سے پہلے ہی رہا پھر شروع ہو گئیں۔

”ہمارے پورے سرکل میں ایک بس وہی کنوارا رہ

اتنے سرد ماحول میں۔ اس لیے یہ فلیٹ لے لیا، یہاں دن کے کسی بھی حصے میں سنسائی نہیں ہوتی۔ ویسے اگر تمہیں یہ پسند نہ آیا تو جہاں تم کوگی۔ بنگلہ لے لیں گے۔“ بیڈروم کے لاک کھولتے ہوئے اس نے اتنی اپنائیت سے کہا کہ وہ بے ہوش ہوتے ہوتے پچی۔ بیڈروم میں داخل ہوتے ہی اسے حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ اس کمرے کی کلر اسکیم، فرنیچر، پردے، کاریٹ حتیٰ کہ پینٹنگ تک وہی تھی جو جہلم والے گھر میں تھی۔ اس کی حیرت بھانپ کر نصیب نے بتایا۔

”میں بہت ہوم سیک ہو رہا تھا پہلے پہل، گھر والے تو آ نہیں سکتے تھے، میں گھر ہی اٹھا کے اس کمرے میں لے آیا۔“ وہ ہولے سے ہنسا اور خوش نما سوچ کر رہ گئی کہ کیا یہ شخص بھی ایسے جذباتی دور سے گزر سکتا ہے۔

”تم ناشتہ کرنا چاہو تو ڈرائیور سے منگا لویا خود ہی کچن میں جا کر بنا لو۔ مجھے یاد نہیں لیکن کچھ تھوڑا بہت تو سلمان ہو گا ہی فرنج میں۔ کل فرصت سے بیٹھ کے لسٹ بناؤ، ضروری چیزوں کی۔“

”لسٹ تو بنا لوں گی لیکن بہترین ہو گا کہ میں خود ہی یہ شاپنگ کر لوں۔ یہاں کی مارکیٹس سے بھی واقفیت ہو جائے گی۔“

”ابنی وے۔“ اس کا مصالحت آمیز دوستانہ سا رویہ خوش نما کی سمجھ سے باہر تھا۔ ”یہ بعد کے کام ہیں فی الحال تم رات کے فنکشن کا سوچو۔ میرے یہاں کے دوست شادی میں شرکت نہیں کر سکے تھے۔ انہوں نے ہمارے لیے بلکہ تمہارے لیے ویلکم پارٹی ارنج کی ہے۔ آج رات کو پی سی میں۔ تم کچھ ریسٹ کر لو پھر تیاری کر لینا۔“

”آج ہی تو ہم آئے ہیں اور آج ہی پارٹی۔“ وہ پریشان ہو گئی۔ (نجانے کیسی پارٹی ہو، کیسے لوگ ہیں، میں تو خود کو ذہنی طور پر تیار نہیں کر پائی، دوسری تیاری کیا کروں۔)

”چھاپھر آپ ایسا کیجیے دو گھنٹے کے بعد ڈرائیور کو بھیج دیجیے گا، میں پارلر جاؤں گی۔ آپ جانتے ہیں

گیا تھا۔ ہمارا تو خیال تھا شاید ہی اس کی پسند کے مطابق کوئی لڑکی ملے، عجیب و غریب سی تو اس کی شرطیں تھیں۔

وہ پوچھنا چاہتی تھی ”کونسی؟“ لیکن رباب اس کے شام کو پہننے والے ڈریس کی تعریف کرنا شروع ہو گئیں۔

”واؤ، بڑی زبردست جوائنس ہے تمہاری، کونس آف دی ایوننگ تم ہی لگو گی اس بلیک ساڑھی میں۔ ویسے بھی تمہاری ہائٹ اور فیکر اس ڈریس کے لیے آئیڈیل ہے۔“

”آلی نو۔“ بڑے اعتماد کے ساتھ مسکراتے ہوئے اس نے بیگ شولڈر پر لٹکایا اور نکلنے کو تیار ہو گئی۔ اب اس تعریف نے اسے چونکایا نہیں تھا۔



پورے تین گھنٹے گزار کر وہ فلیٹ پہ پہنچی تو نصیب آچکا تھا۔

”تم نے لینگ لیا؟“ اس کے سامنے کے ایف سی کے لینگ باکسز بند پڑے تھے۔ خوش نمائے وال کلاک پہ نظر ڈالی۔ شام کے چھ بج رہے تھے پھر بھی وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”جی۔۔۔ وہ۔۔۔ ربا اصرار کر رہی تھیں تو ہم نے۔۔۔“

”اوکے۔۔۔ اٹس آل رائٹ۔۔۔ مجھے یہی فکر تھی کہ کہیں تم تکلف میں نہ ماری جاؤ۔ ویسے اگر کچھ ہلکا پھلکا کھانا ہو تو پلیز جوائنس می۔۔۔ بس۔۔۔ ود ٹو کھس آفٹی۔۔۔“

وہ مسکراتی ہوئی چائے بنانے چلی گئی۔ اس کے سامنے بھاپ اڑاتا مک رکھنے کے بعد وہ سامنے ہی بیٹھ کے بے تکلفی سے اس کی پلیٹ سے فریج فرائز اٹھا کے کھانے لگی۔ وہ دلچسپی سے اس کے چہرے پہ تازہ تازہ میک اپ کو دیکھنے لگا۔

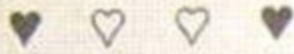
میٹرا شامل اور میک اپ سے بالکل مطابقت نہ رکھنے والے لان کے ملکہ آسمانی سوٹ میں ملبوس وہ عجیب سی لگ رہی تھی لیکن اسے شاید اس کا احساس

تک نہ تھا۔

کمرے تک جا کے وہ دوبارہ پلٹا۔ وہ برتن اٹھا کر کچن تک لے جا رہی تھی۔

”یہ تم نے کون سا سوٹ نکال دیا ہے۔ بلیک ڈنر سوٹ نکال دیا پھر گرے لائننگ والا جو آنٹی کے گھر پہنا تھا۔“

”میں ان دو کلرز میں آپ کو دیکھ دیکھ کے تنگ آچکی ہوں۔“ بڑی ہمت کی گھسی اس نے یہ فقرہ ادا کرنے میں۔ ”آپ یہ والا سوٹ ہی پہن لیتے ہیں۔ اور جہاں تک آپ کی اس بات کا تعلق ہے کہ بلیک کلر آپ کی شخصیت کو ابھارتا ہے تو اس کی فکر مت کیجئے۔“ وہ ایک لحظہ رکی پھر مڑتے ہوئے کہہ گئی۔ ”میں نے اپنے لیے بلیک کلر کا انتخاب کیا ہے۔“



کرش شیفرن کی بلیک ساڑھی میں وہ سچ مچ فان کلر کے سوٹ میں ملبوس نصیب احمد کی شخصیت کو مزید ابھار رہی تھی۔ اس کی پراعتقاد چال سے یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ اس لباس کو پہننے کا اس سے پہلے اسے کوئی تجربہ نہ تھا۔

ساڑی کے پلو اور بلاؤز کی فل آستینوں پہ گولڈن نفیس کام تھا، سیاہ پتھروں والے گولڈ کے سیٹ، ایک کلائی میں رونمائی کا تحفہ اور دوسری میں رسیٹ واپج کے ساتھ وہ سادگی و نفاست کا شاہکار لگ رہی تھی۔

ہال میں موجود نصیب کے کولیگز، ان کی مسز اور تمام لوگوں کا اپنے لیے شاندار استقبال دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ سب اس سے ایسے مل رہے تھے جیسے عرصے سے جانتے ہوں۔ نصیب اس کا ہاتھ تھامے یوں ایک ایک کے پاس لے جا رہا تھا جیسے وہ اسے ملنے والی کوئی ٹرائی تھی جسے وہ فخر سے سب کو دکھا رہا ہو۔

”نادر جمالی صاحب! ہماری بیگم نہ صرف آپ کی فین ہیں بلکہ مجھے یہ بتاتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یہ خود بھی بڑی خوبصورت اور حساس شاعرہ ہیں۔“ ایک بار لیش سے شخص سے اس نے خوش نما کا تعارف کرایا تو وہ مرعوب سی ہو گئی۔ واقعی وہ اس کے

گھر تو پہنچ لینے دو۔“

”نہیں پلیز“ آپ ابھی بتائیے وہ کون تھی جس کے لیے آپ دو سال انتظار کرتے رہے اور پھر آپ کو مجبوراً ”مجھ سے شادی کرنا پڑی۔“

”وہ تم ہی ہو۔“ اس نے رفتار آہستہ کرتے ہوئے انکشاف کیا۔

”مجھے بے وقوف مت بنائیے۔ آپ مجھے بھلا کب جانتے تھے دو سال پہلے۔“

”جانتا نہیں تھا ماننا تو تھا۔“

”آخر آپ صاف بات کیوں نہیں کرتے؟“

”صاف بات۔۔۔“ ہار مان کے وہ بتانے پہ تیار ہو ہی گیا۔ خوش نما نے خود کو ہر طرح کی بات سننے کے لیے تیار کر لیا۔

”جب مجھے یہ جاب ملی اور میں زندگی میں پہلی بار گھر سے دور ہوا تو میری حالت بہت عجیب سی تھی، کچھ عرصہ پہلے ہی امی کی وفات ہوئی تھی، کچھ اداسی اس کی تھی، قبل تب بھی سی تھی اور میں اس سے خاصا اٹیچ تھا۔ یہاں آنے کے بعد میں شدید تنہائی اور ڈپریشن کا شکار ہو گیا۔ ہر وقت بچوں کی تصویریں پھیلائے بیٹھا رہتا۔“

ایسے ہی کسی اداس سے دن میں نے بھابھی کو فون کیا۔ ان سے خبر ملی کہ بلبل اب چلنا شروع ہو گئی ہے میں اسے دیکھنے کو چل گیا لیکن تب میرا ٹریننگ پیریڈ چل رہا تھا میں جانہ سکتا تھا۔ بھابھی نے اپنے بھائی کی شادی کی مووی بھیج دی۔ جس میں بلبل ادھر سے ادھر بھاگتی دوڑتی پھر رہی تھی۔ میری ساری اداسی دور ہو گئی اس مووی کو دیکھنے سے۔ میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے پیارے چہرے کھوج رہا تھا، بھابھی، حبیب بھائی، اباجی، جگنو، بلبل سب کے پیارے پوز اسٹل کر کے دیکھ رہا تھا کہ ایسے میں تم سنائی دیں۔

ہاں سنائی دیں۔۔۔ میں نے غور کیا، پچھلے ایک گھنٹے کے دوران اسکرین پہ کئی بار تمہاری جھلک دکھائی دی تھی لیکن میں چونکا تب جب تمہاری آواز سنائی دی۔ خوبصورت آوازوں کا میں ہمیشہ سے شیدائی تھا۔

پسندیدہ شاعر تھے۔

”بہت خوب“ یعنی ہمارے حلقے میں ایک اور شاعر کا اضافہ۔ بھی اب تو ان گیت نوگیدر، نیو ایئر پارٹیز اور یون فائر کے ساتھ ساتھ مشاعرے کا بھی اہتمام کرنا پڑے گا۔“ مسٹر ولی نے خوش دلی سے کہا۔

”آپ غزل کہتی ہیں خوش نمایا نظم آپ کا ذریعہ اظہار ہے؟“ نادر جمالی صاحب نے مشفق انداز میں کہا۔

”جی بس کبھی کبھار نظم کہہ لیتی ہوں۔“

”بھئی، ہم تو غزل کے شیدائی ہیں لیکن اچھی نظم کہنے والوں کو بھی داد دیتے ہیں۔“

”ہاں بھابھی! پلیز کوئی خوبصورت سی نظم سنائیے۔“ نصیب کے کسی اور بے تکلف دوست نے اصرار کیا۔

”بلکہ سنائیے نہیں گنگنائیے وہی گیت جسے سن کر ہمارا یار مجنوں ہوا تھا۔“ ولی کی بات پہ وہ بری طرح چونکی۔

”نصیب کا کیا قصور، میں بھی جب صبح ان سے پہلی بار ملی تو دیکھنے کے بعد نہیں بلکہ سننے کے بعد فدا ہی ہو گئی۔“ رہانے انکشاف کیا۔

”میں تو کہتی ہوں یہ دو سال کیا نصیب اگلے دو سال اور بھی انتظار کرتا تو یہ خوش نما کا حق بنتا تھا۔“

”گیت۔۔۔ دو سال۔۔۔ آوانس۔۔۔“

ان مبہم اشاروں میں وہ ایسا الجھی کہ کب تقریب کا خاتمہ ہوا، اسے پتا ہی نہ چل سکا۔ نصیب نے اس کا کھویا ہوا انداز بھانپ کر سب کے اصرار کے باوجود جلد ہی جانے کی اجازت طلب کر لی تھی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ مزید صبر نہ کر سکی۔

”یہ سب کیا اسرار ہے؟ میں تو کچھ سمجھ نہیں پا رہی۔ کیا آپ کسی اور کو پسند کرتے تھے؟ کہیں یہ لوگ مجھے وہی تو نہیں سمجھ رہے؟“ اس کے دماغ کے اندر جتنے بھی سوال کلبل رہے تھے وہ سب اس نے ایک ساتھ داغ دیئے۔

”ایک منٹ ایک منٹ بتانا ہوں سب بتانا ہوں“

خواتین ڈائجسٹ پبلی کیشنز

کی ایک خوبصورت پیشکش

نامور مصنفہ رضیہ جمیل

کا ”ساگر دریا بادل بوند“

کے بعد مشہور و معروف ناول

لکھنؤ عرف کا

اب کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے

☆ خوبصورت سرورق

☆ مضبوط جلد

☆ آفست پیپر

قیمت صرف = 300 روپے

کتاب منگوانے کے لیے

آج ہی = 330 روپے

کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ

ارسال فرمائیں۔

ملنے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی

تمہاری آواز سب سے جدا اور بھرپور رنگ لیے تھی۔
تم ڈھولک پہ چمچہ بجاتے ہوئے ہندی کا کوئی گیت گا
رہی تھیں۔ تمہاری آواز کے کوچ کے سامنے ساری
لڑکیاں سحرزدہ سی بیٹھی تھیں۔ میں اکثر وہ مووی لگا کر
تمہارا گیت سننے لگا، تب مجھے صرف تمہاری آواز
اٹریکٹ کرتی تھی لیکن آہستہ آہستہ شاید تم میرے
حواسوں پہ چھانے لگی تھیں۔

انجانے سے رستے سے تم کسی طرح دل کے اندر
تک پہنچ گئی تھیں مگر مجھے پتا ہی نہ تھا۔ میں تب باخبر ہوا
جب پچھلے سال بھابھی نے میری شادی کا ذکر چھیڑا اور
مجھ سے میری پسند کے بارے میں پوچھا۔ پتا نہیں کس
طرح چھن سے تم میرے تصور میں اتر آئیں۔

”ہلکے سبز سوٹ میں میک اپ سے بے نیاز چمکتی
شفاف بے داغ سلونی سی صورت کے ساتھ سادہ سی
آنکھوں میں دنیا جہاں کی معصومیت سمیٹے۔ ایک
سحر تھا خوش نما تم میں کہ میں وہیں بیٹھے بیٹھے جکڑ گیا۔“
نصیب کی آواز خوش نما کو کہیں دور سے آتی
محسوس ہو رہی تھی۔ یہ ساری کہانی اسے پریوں کی
کہانی لگ رہی تھی۔

”بھابھی نے جیسے مجھے جھنجھوڑ کر دوبارہ یہ سوال کیا۔
تب میں نے سنبھل کر اشارے کنایے سے انہیں
تمہارا حلیہ بتایا۔

”بھابھی! وہ پہلی نظر میں چونکا دینے والی شخصیت نہ
رکھتی ہو بلکہ زینہ بہ زینہ دل کے اندر تک اترنے کی
صلاحیت رکھتی ہو۔ اس کی آنکھوں کا رنگ بھلے کچھ
بھی ہو مگر ان میں حیا کے سائے اور معصومیت کے
عکس ضرور ہوں۔ اور سب سے بڑی بات اس کی
آواز۔ آواز ضرور خوبصورت ہونی چاہیے بھابھی۔
جیسے چاندی کی گھینٹاں۔۔۔ نہیں۔۔۔ جیسے بھرتا۔۔۔ یا
پھر۔۔۔ کوئل کی چکار۔۔۔ اور بھابھی! وہ اتنی معصوم ہو
کہ اپنے حسن سے اپنی کشش سے آگاہ ہی نہ ہو۔“

میرا خیال تھا کہ تم بھابھی کی قریبی عزیزہ ہو گی۔ اس
لیے وہ میرے اشاروں کے ذریعے تم تک پہنچ ہی
جائیں گی لیکن نجانے کیوں وہ ادھر ادھر لڑکیاں تلاش

شروع ہو گئیں۔

کچھ عرصہ میں نے بڑے صبر سے انتظار کیا پھر ان سے بات کر ہی لی۔ وہ بے حد حیران تھیں۔ مجھے تمہارے بارے میں ساری تفصیل بتائی۔ میں رضامند تھا مجھے صرف تمہارا ساتھ چاہیے تھا۔ بھابھی نے کچھ عرصہ اور انتظار کرنے کو کہا کیونکہ اتفاق سے کچھ روز پہلے ہی تمہاری اماں کا انتقال ہوا تھا۔ پھر انہوں نے ہی سارے معاملات طے کیے۔ اب جی کو کوئی اعتراض تھا نہ نانو کو۔ سب ہی میری خوشی میں خوش تھے اور تمہیں اس گھر میں لانے کے لیے راضی۔

گھر آگیا تھا اس نے گاڑی روکی۔ وہ اتر کر ایک معمول کی طرح آگے بڑھ گئی۔ اس کی خاموشی معنی خیز تھی۔ نصیب چپ چاپ اس کے پیچھے چلا آیا۔ وہ بیڈ پہ گم صدم بیٹھی تھی۔

”کیا ہوا خوش نما؟ کیا اتنی بد گمان ہو مجھ سے کہ میری زندگی کی سب سے خوبصورت سچائی پہ ایمان نہیں لارہیں؟“ وہ گٹھنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”میں کیسے ایمان لاؤں؟ کیسے بھول جاؤں آپ کے شروع دنوں کے رویے کو۔ جو کچھ آپ اب کہہ رہے ہیں اگر یہ سچ ہے تو پھر وہ کیا تھا جو آپ اس وقت کہتے تھے جب میں لاکھوں امیدیں لیے ہزاروں خواب آنکھوں میں سجائے آپ کے گھر آئی تھی۔“ دل کی الجھن زبان پہ آئی گئی۔

”لاکھوں امیدیں۔۔۔ ہزاروں خواب۔۔۔ اور کروڑوں وسوسے بد گمانیاں تو ان گنت تھیں ان کی کوئی حد تھی نہ شمار۔“ نصیب نے جتایا۔ وہ سر جھکا کر رہ گئی۔

”بھابھی نے تمہارے سارے خدشے بیان کیے تھے مجھ سے کہ تم اس غلط فہمی کا شکار ہو کہ تمہیں ترس کھا کر انسانی ہمدردی کے طور پہ قبول کیا جا رہا ہے۔ پھر ہندی والے واقعہ نے مجھے یہ باور کروایا کہ تم خود ترسی کے ساتھ ساتھ احساس کمتری کا بھی شکار ہو۔ اس میں تمہارا قصور نہ تھا تمہارے ساتھ جو حالات

رہے اس میں اچھے خاصے مضبوط اعصاب کے مالک افراد بھی اپنا اعتماد کھو سکتے تھے۔ اس لیے تمہارا اعتماد واپس لانے تمہاری بد گمانیاں دور کرنے کے لیے مجھے یہ سب ڈرامہ کرنا پڑا۔“

”مجھ پہ ایسے عجیب و غریب فقرے کس کے اور سب کے سامنے میرا مضحکہ اڑا کے آپ سمجھتے تھے۔ آپ میرا علاج کر رہے ہیں۔“ وہ حقیقت جان کر پھٹ پڑی۔ ”جانتے ہیں آپ کی باتیں سننے کے بعد میرا دل چاہتا تھا۔ میں خود کشی کر لوں۔“

”یہ تمہارے ابتدائی احساسات تھے۔ تم مانویانہ مانو لیکن میرا طریقہ کار کارگر رہا۔ یار! تم خود بتاؤ اگر میں پہلی ملاقات میں وارفتگی جتنا تاؤ تم کیا سمجھتیں۔ ترس ہمدردی۔۔۔ ہے ناں؟ اس لیے میں نے رفتہ رفتہ تمہارا اعتماد بحال کیا۔ سب سے پہلے ایک طویل چھٹی کے ذریعے تمہیں اپنے گھر اور گھر والوں کے قریب رہ کر ان سے مانوس ہونے کا موقع دیا ورنہ سب سمجھ رہے تھے کہ ایک ماہ کی چھٹی میں نے کسی لمبے ہنی مون ٹرپ کے لیے لی ہے۔ جب تمہیں ایک بھرے پرے کنبے کی اپنائیت ملی تو خود پہ تمہارا اعتماد بحال ہوا۔

اب میری بے نیازی تمہیں کھلنے لگی، تم سوچنے لگیں کہ جب اور لوگ تمہاری حیثیت تسلیم کر سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں؟ تب تم نے اس چیلنج کو پورا کرنے کی ٹھانی۔ تمہارا بغیر کسی پس و پیش کے اسلام آباد چلے آنا اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی اور یہی میں چاہتا تھا کہ بجائے اس کے کہ میں تمہیں تمہارے ہونے کا احساس دلاتا تم خود آگے بڑھ کر مجھے اپنے وجود کا احساس دلاؤ۔“

”اور اگر۔۔۔ اگر اس سارے قصے میں میں آپ سے نفرت کرنے لگ جاتی۔۔۔ شدید نفرت۔۔۔ تو پھر؟“ لب دانتوں تلے دبا کے اس نے شرارت سے پوچھا۔

”نفرت اور مجھ سے؟ رج کے سوئے منڈے سے۔۔۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ذرا میری آنکھوں میں دیکھ کر بتاؤ کیا میں نفرت کے قابل ہوں؟“ اس نے

”خبردار لڑکی خبردار۔“
 ”اچھا اچھا کچھ اور سناتی ہوں۔“
 برے نصیب میرے
 برے نصیب میرے
 میں نے تجھے۔

اسے ناراضی سے اٹھ کر کھڑے ہوتے دیکھا تو
 مشکل سے شرارت پہ آمادہ دل کو کان پکڑ کر سرزنش
 کی۔

”براہوں ناں میں، ٹھیک ہے یاد رکھو، تم تنہا بھی ہو
 اور بے بس بھی، ظلم و ستم کی انتہا کروں گا۔“ اس نے
 جلاو صفت شوہر کے اسٹائل میں دھمکی دی۔
 ”لو خواہ مخواہ میں تنہا اور بے بس۔ ایک فون کروں
 نانو، اباجی، حبیب بھائی، باجی سب آجائیں آپ کی خبر
 لینے۔“

”اس کا مطلب ہے، میں نے آپ اپنے پیر پہ
 کلہاڑی ماری ہے۔“

وہ روٹھ کے دور بیٹھ گیا۔ پیچھے سے خوش نما نے
 دھیرے سے اس کے شانے سے ٹیک لگاتے ہوئے
 گنگناہٹ بکھیری۔

منڈا سونے رنگ دا
 دل لے گیا۔

میرا سول رب دی
 منڈا سونے رنگ دا

انگی سے اس کا جھکا چہرہ اٹھا کے پوچھا۔ آج تو اس
 چہرے کی جگمگاہٹ عروج پہ تھی۔ خوش نما کی جیسے
 آنکھیں ہی چندھیا گئیں۔
 ”میں تو اب تک یہ ہی نہیں سمجھ پائی کہ آخر آپ
 نے مجھ میں کیا دیکھا۔ ایک عام سی لڑکی میں۔“ وہ
 اتنے قریب اسے پا کر اس کی شخصیت کے سرے
 مرعوب ہو گئی۔

”جب آنکھ میں شام اترے

پلکوں پہ شفق چھو لے

کا جل کی طرح میری

آنکھوں کو دھنک چھو لے

اس وقت کوئی اس کو

آنکھوں سے میری دیکھے

پلکوں سے میری جوئے۔“

سحرزدہ سی آواز میں گنگنا تا وہ اس کے قریب ہوا تو وہ
 بل کھا کے پرے سرک گئی۔

”اور ایک بات اور سب جس کا شک مجھے بہت پہلے
 سے تھا، میری ڈائری سے نظمیں چرا کر کے آپ ہی
 بھجواتے رہے ہیں ناں؟“

”تم میرا سب کچھ چرا لو اور میں تمہاری دو چار
 نظمیں تک نہیں چرا سکتا۔“

”نہیں بلکہ سچ پوچھیں تو یہ بھی آپ کا احسان ہی تھا
 مجھ پہ ورنہ اس سے پہلے کب مجھے اس بات کا احساس
 ہوا کہ مجھ میں بھی کوئی صلاحیت ہے۔“

”اب ایک احسان آپ بھی کرو دیجئے۔“ اس نے
 فرمائش کی۔

”عرصے سے خواہش تھی کہ کبھی تم میرے سامنے
 بیٹھ کے کچھ گنگناؤ۔ پلیز۔ آج صرف چند بول۔“
 اس کے اتنے اصرار پہ وہ مان گئی۔

”رنگیلارے

تیرے رنگ میں

پول رنگا ہے، مم۔

نصیب نے فوراً ”اس کے منہ پہ ہتھیلی جمادی۔ وہ
 بے ساختہ ہنسنے لگی۔